اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

جون ۲۰۲۰ء

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

# اسلام اور ردِّ مغرب

## مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

- مغربی تہذیب کے قابل ردّ ہونے کے نو (۹) شرعی و عقلی مبسوط دلائل
- ردّ مغربی تہذیب کے موقف پر اشکالات واعتراضات کا جائزہ
- ردّ مغربی فکر و تہذیب کے تقاضے

**ڈاکٹر محمد امین**

صفحات: ۲۱۶

قیمت: ۲۵۰ روپے بغیر ڈاک خرچ

**مکتبہ البرہان، لاہور**

کیا تحریک انصاف کی

# حکومت کا یکساں قومی نصاب قابل ردّ ہے؟

## ایک تجزیہ۔ایک مطالعہ

پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تحریک انصاف کی حکومت ہیومنزم اور سیکولرازم کے اصولوں پر یکساں نصاب بنا رہی ہے۔اس کے خلاف ملک کے مندرجہ ذیل ممتاز ماہرین تعلیم، علماء کرام اور اسلامی سکالرز کا ردّعمل:

- پروفیسر ملک محمد حسین، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم، خالد رحمن، پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیر کیانی، پروفیسر عبدالواحد سجاد، پروفیسر عبدالخالق وٹو، پروفیسر شاکر علوی، عبدالحفیظ عابد، انجینئر لبیب، منصور اصغر راجہ، مقدر عباس
- مولانا زاہد الراشدی اور مولانا سردار محمد خاں لغاری

ترتیب و تہذیب


**ڈاکٹر محمد امین**
پروفیسر علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور

**پروفیسر ملک محمد حسین**
سابق ڈائریکٹر سٹاف ڈویلپمنٹ ڈائریکٹوریٹ، پنجاب



صفحات: ۲۰۸

**مکتبہ البرہان**

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی مرتبہ تازہ کاوش

# مدرسہ ڈسکورسز

## مطالعہ وتجزیہ

پاک وہند کے دینی مدارس کے طلبہ کے فکری اغوا کے لیے امریکی مسیحی مشنری یونیورسٹی کی علمی اور مالی مدد سے پاک وہند کے متجددین کی کاوشوں کے خلاف

**پاکستان کے** ڈاکٹر ابصار احمد ڈاکٹر محمد امین محمد دین جوہر
مفتی منیب الرحمن سید خالد جامعی عامرہ احسان
ڈاکٹر زاہد صدیق مغل آصف محمود اور

**بھارت کے** مفتی محمد اللہ قیصر قاسمی یاسر ندیم الواجدی کے علمی مقالات کا مجموعہ

صفحات: ۱۵۶ قیمت: ۱۸۰ روپے بغیر ڈاک خرچ


**مکتبہ البرہان**

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۴، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۰ء/شوال ۱۴۴۱ھ

# مشمولات

○فکرونظر

صورِ اسرافیل ۴

○تعلیم وتربیت

۔پاکستان میں مجوزہ یکساں قومی نصاب تیاری کا مجوزہ لائحہ عمل — پروفیسر ملک محمد حسین ۵

۔نفاذِ اسلام میں نظامِ تعلیم کا کردار — مولانا زاہد الراشدی ۱۳

۔مجوزہ یکساں حکومتی نصاب میں ہیومنزم کی اقدار کا معاملہ مسئلہ سوئے نیت کا نہیں، ناقص فہم وشعور کا ہے — نائب مدیر ۱۶

○فہم دین

۔عصر حاضر میں جدید اسلامی تحریکوں کا کردار سید سعادت اللہ حسینی صاحب کے غوروفکر کے لیے چند تجاویز — ڈاکٹر محمد امین ۲۰

۔علماء کرام اور فتنۂ تصویر — مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ ۳۴

۔ہمیں نیا اسلام نہیں چاہیے — مدیر ۳۵

۔'انجینئر محمد علی مرزا۔ افکار ونظریات' — ڈاکٹر محمد زبیر ۳۶

○تفہیم مغرب

کیا مغربی تہذیب قرآنی اصولوں پر مبنی ہے؟ — محمد دین جوہر ۴۱

○کرونا

۔ کرونا ۔ سچ کیا ہے؟ — مدیر ۴۵

۔ ملی مجلس شرعی کی قرارداد ۴۸

○اسلاا ور پاکستان

راجہ داہر کو سندھ کا بیٹا اور قومی ہیرو بنانے کی مہم — محمد عاصم حفیظ ۴۹

○خودنوشت

مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا (۴) — مدیر ۵۲

فکرونظر

# صورِ اسرافیل

کرونا آیا

خوف ودہشت کی فضا، ہیبت، اضطراب، افراتفری، تھرتھلی (Panic) ہرسو چھا گئی۔

لوگ کرونا سے ایسے ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

لیکن لوگوں کا کردار نہ بدلا

وہی جھوٹ وغیبت، وہی چوری وڈکیتی، وہی ذخیرہ اندوزی وگراں فروشی، وہی فراڈ و بددیانتی، وہی رشوت وکرپشن، وہی حرص وحسد، وہی جنگ اقتدار، وہی فحاشی وعریانی اورفروغ زنا، وہی قتل وغارت، وہی فرقہ واریت، وہی تجدد، وہی بے حسی، وہی....

کرونا موجود تھا کہ رمضان بھی آ گیا یعنی ماہ تقویٰ

عبرت پکڑنے اور سنورنے کا نادر موقع ومحرک

لوگوں نے روزے بھی رکھے، بھوک پیاس بھی برداشت کی، افطاریاں بھی کرائیں

تراویح بھی پڑھیں، شبینے بھی سنے، فطرانے بھی دیے....

لیکن لوگوں کا کردار نہ بدلا

وہی جھوٹ وغیبت، وہی چوری وڈکیتی، وہی ذخیرہ اندوزی وگراں فروشی، وہی فراڈ و بددیانتی، وہی رشوت وکرپشن، وہی حرص وحسد، وہی جنگ اقتدار، وہی فحاشی وعریانی اورفروغ زنا، وہی قتل وغارت، وہی فرقہ واریت، وہی تجدد، وہی بے حسی، وہی....

غرض یہ کہ کرونا بھی آیا، رمضان بھی آیا لیکن تقویٰ نہ آیا

لوگو! کب بدلو گے؟

کیا صورِ اسرافیل کے منتظر ہو؟

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

# پاکستان میں یکساں قومی نصاب۔ تیاری کا مجوزہ لائحہ عمل

تعلیمی نصاب سازی ایک سنجیدہ عمل ہے بلکہ یہ قومی تعمیر کا طویل المیعاد منصوبہ ہوتا ہے جس کے مطابق مستقبل کی نسل پرورش پاتی ،قومی تہذیب وثقافت کے تسلسل کا باعث بنتی اوراقوام عالم میں اپنا مقام پیدا کرتی ہے بلکہ میرے نزدیک تو یہ اقوام عالم کو امن وآشتی کے ساتھ اپنے اندر جذب کرکے ایک گلوبل معاشرہ پیدا کرتی ہے جس کا منتہائے مقصود اللہ کی رضا اورآخرت کی کامیابی ہوتا ہے۔ یہ کوئی نعرہ بازی، سستی ہردلعزیزی اور اِدھر اُدھر سے مانگ تانگ کرایک بے جوڑ لائحہ عمل تیار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ جو علم رکھتے ہیں ان کی بصیرت اورکوشش سے کام لے کر مقصد حیات کے لیے تیار کرنے والا صراطِ مستقیم ڈھونڈھا جاتا ہے اور پھراس صراطِ مستقیم پر معاشرے کے سب متعلق لوگوں سے رہنمائی لے کر ان کا اتفاق رائے حاصل کیا جاتا ہے۔ مسئلہ قوم کا ہے، معاشرے کا ہے اور سب کا ہے اس لیے کامیابی کے لیے سب کا اتفاق رائے ضروری ہے خصوصاً ان کا جو مقصدِ حیات، نظامِ حیات اور اخروی کامیابی کے ساتھ اس دنیا میں خوش حالی پر متفق ہوں۔ اس طرح کا کام کھلے معاشروں میں چھپ چھپا کراور سربستہ راز کی طرح نہیں کیا جاتا بلکہ روزروشن میں پوری تحقیق، مطالعہ اور تجزیہ وتحلیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ذیل میں ہم پاکستان میں نصاب سازی کی نوعیت اور عمل پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں اور ماہرین تعلیم سے گزارش کرتے ہیں کہ اگر وہ ہماری سکیم کو درست سمجھیں تو براہ کرم نصاب سازی میں مختلف حکومتوں کی کاوشوں اور خصوصاً موجودہ حکومت کی سنگل نیشنل کریکولم کو مدّون کرنے کے عمل اور ماحصل کا تنقیدی جائزہ لیں اور اپنی ماہرانہ آراء سے قوم کی رہنمائی کریں۔

## پاکستان میں نصاب سازی کے مآخذ

مختصراً پاکستان میں اگر تعلیم کی بات کرنا ہو تو ہم تحریک پاکستان، تحریک پاکستان میں بیان کیے گئے قائدین تحریک پاکستان کے عزائم، وہ نصب العین جس کے حصول کے لیے

مسلمانانِ برصغیر نے قائداعظم اور علامہ اقبال کی دعوت پر لبیک کہا تھا اس کی بات کریں گے۔ قائدین تحریک پاکستان کی جدوجہد میں شامل وہ لوگ بھی تھے جن کے علاقے اب پاکستان میں شامل ہیں لیکن غالب اور پُر جوش اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جن کے علاقے پاکستان میں شامل ہونا تھے، نہ ہوئے اور اب وہ ہماری آزادی بلکہ ''مادر پدر آزادی'' کی قیمت آر ایس ایس کے غنڈوں کے ناقابل بیان مظالم سہہ کر ادا کر رہے ہیں اور ہم اِدھر قائدین تحریک پاکستان اور تحریک پاکستان کے ان غداروں کے یرغمال بنے ہوئے ہیں جو سیکولرزم اور لبرلزم کا جھنڈا اٹھائے ہماری آئندہ نسلوں کے اسلامی مستقبل کو غارت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

تحریک پاکستان کے نصب العین میں دین اسلام اور اقامت دین اسلام کے سوا کوئی ہدف اور کوئی مقصد و مدعا نہ تھا۔ گویا اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضوں کے مطابق قومی کی تعمیر ہمارے نظام تعلیم، ہمارے نصاب تعلیم اور ہماری تمام تعلیمی پالیسی کو جو امور بنیاد فراہم کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ قراردادِ مقاصد

۲۔ پہلی آل پاکستان قومی تعلیمی کانفرنس اور اس میں قائداعظمؒ کا پیغام

۳۔ آئین پاکستان کا آرٹیکل 31 اور تعلیم و انسانی حقوق کے متعلق دیگر آرٹیکلز

۴۔ ۱۹۵۹ء کا قومی تعلیمی کمیشن اور اس کی نظام تعلیم پر تفصیلی رپورٹ

۵۔ مختلف اوقات میں جاری کی جانے والی قومی تعلیمی پالیسیاں اور ان میں تسلسل کے ساتھ قومی نظام تعلیم میں اسلامی نظریہ حیات کی کارفرمائی۔

اوپر بیان کیے گئے سب حقائق کے ساتھ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی 97.5 فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اڑھائی فیصد اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی حقوق کی محافظ پاکستان کی مسلم اکثریت ہے، پاکستان کا آئین ہے اور سب سے بڑھ کر غیر مسلموں کے وہ حقوق ہیں جن کا تحفظ قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے اور اسوۂ حسنہ میں ان کی روشن اور ناقابل تردید مثالیں موجود ہیں۔ نظام تعلیم کی تشکیل انہی حقائق کی بنیاد پر ہوتی ہے اور نصاب تعلیم کی تدوین بھی اسی فریم ورک میں ہوگی۔ اس ساری گفتگو کو اگر کسی نقشہ میں

ڈھالا جائے تو صورت کچھ یوں بنتی ہے:

## قومی تعلیمی نصاب کی اساسیات

پاکستان کا قومی تعلیمی نصاب جن بنیادوں پر استوار ہوگا وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلامی نظریۂ حیات یعنی نظریۂ پاکستان اور تحریک پاکستان کے تقاضے

۲۔ دستور اسلامی جمہوریۂ پاکستان اور اس میں شامل قراردادِ مقاصد کے علاوہ آرٹیکل 31 اور دیگر اسلامی اور تعلیمی آرٹیکلز۔

۳۔ پانچ سال سے ۱۶ سال کی عمر کی لازمی تعلیم کے تقاضے

۴۔ بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی نشوونما کے مختلف مراحل کے تعلیمی تقاضے

۵۔ پاکستان کے متنوع طبعی، جغرافیائی اور علاقائی تقاضے

۶۔ پاکستان کے متنوع معاشرتی، ثقافتی، لسانی اور معاشی تقاضے

۷۔ عصری تکنیکی، صنعتی، زرعی اور ماحولی ضروریات اور مستقبل کی سائنس وٹیکنالوجی کی ضروریات

۸۔ پاکستان کی انسانی وسائل کی ترقی، تربیت اور مستقبل کی ضروریات

۹۔ پاکستان میں اندرونی امن، اخوت، تعاون، رواداری، برداشت اور اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی ضروریات

۱۰۔ عالمی معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے اور ایک عالمی نظریۂ حیات یعنی اسلام کا علمبردار ہوتے ہوئے حال اور مستقبل کی ذمہ داریاں نیز عالمی معاہدوں اور اصولوں کی پاسداری۔

ہم یہاں رُک کر آرٹیکل 31 کے تقاضے اور ۵ سال سے ۱۶ سال کی عمر کے طلباء کی تعلیمی یعنی نصابی ضروریات کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے تاکہ معلوم ہوجائے کہ وہ اساسات جن پر نصاب کی بنیاد رکھی جاتی ہے وہ کس طرح نصابی تقاضوں میں ڈھالی جاتی ہیں۔

آئین کے آرٹیکل 31 کے مطابق یہ ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے شہریوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنائے جیسا کہ قرآن وسنت میں میں بتایا گیا ہے۔ دوسری طرف ۵ سال سے ۱۶ سال کی عمر میں قانونی طور پر تعلیم لازمی ہے یعنی ایک شخص کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل بنانے کا ریاست کے پاس یا بالفاظ دیگر نظامِ تعلیم کے پاس جو عرصۂ تعلیم میسر ہے وہ ۵ سال سے ۱۶ سال کی عمر کا عرصہ ہے کیونکہ اس کے بعد طالب علم بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھ دے گا اور اسلام کی طرف سے ایک فرد پر جتنا اسلام کا علم، فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں تاکہ وہ ایک مسلمان فرد کی حیثیت سے قرآن وسنت کے مطابق کامیاب زندگی گزار سکے وہ عائد ہوجاتی ہیں لہٰذا نصاب تعلیم میں اسلام کا وہ پورا علم جو فرض عین کی سطح پر مطلوب ہے وہ تمام فرائض اور ذمہ داریاں جو بالغ مسلمان مرد یا عورت پر عائد ہوتی ہیں وہ سب شامل ہونی چاہئیں۔ اس کے لیے ہمیں ایمانیات، عبادات، اخلاقیات، معاملات کے تحت اسلام کے تمام تصورات، حقائق اور معلومات کی جامع فہرست بنانا ہوگی جس کا مآخذ قرآن حکیم، احادیث مبارکہ اور اسوۂ حسنہ ہوگا۔ کچھ ماہرین مل کر یہ فہرست بنائیں گے

اور جید علماء کرام سے اس کی تائید وتوثیق حاصل کی جائے گی۔ جب مذکورہ فہرست تیار ہو جائے تو ماہرین نفسیات بشمول کلاس روم ٹیچرز اس فہرست کو جماعت اوّل سے جماعت دہم تک مرحلہ وار تقسیم کریں گے۔ جماعت وار تقسیم کے بعد ماہرین تدریس ونفسیات فیصلہ کریں گے کہ اس مطلوبہ جماعت وار فہرست میں اسلامی معلومات، ایمانیات، عبادات، اخلاقیات اور معلومات کا کون سا حصہ خالص اسلامیات کے مضمون میں شامل ہوگا اور کون کون سے تصورات اردو، انگریزی یا مقامی زبان اور معاشرتی علوم میں نظموں، کہانیوں اور دیگر تدریسی لوازمہ کے طور پر شامل ہوں گے۔ مختصراً یہ کہ یہ لازمی اسلامی کورس محض اسلامیات کے مضمون میں ہی نہیں بلکہ تمام مضامین میں پھیلا دیا جائے گا۔ یہ ایک پہلو سے ہم نے ذرا تفصیلی مثال دی ہے تا کہ پتہ چلے کہ نظریاتی اساسات کس طرح نصاب تعلیم میں ڈھلتی ہیں اور کس طرح جماعتوں اور مضمون واران کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں۔

## نصاب سازی کے مختلف پہلو

**کریکولم ڈویلپمنٹ:** کریکولم ڈویلپمنٹ کو ہم اپنی زبان میں نصاب کی تدوین اور ترقی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک عمل ہے جس کے ذریعے سے ہم نصابِ تعلیم قدم بہ قدم تیار کرتے ہیں۔

الف۔ اس کا پہلا قدم یہ ہوگا کہ نسبتاً بڑا گروپ بنایا جائے گا جس میں علماء کرام، ماہرین سائنس، ماہرین سماجی علوم، ادیب، شاعر، دانشور، پڑھے لکھے سیاسی زعما اور متنوع علاقوں سے منتخب اساتذہ جن میں ہر جماعت اور سطح کے اساتذہ شامل ہوں گے۔ یہ وسیع البنیاد گروپ اساسات تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے نصابِ تعلیم پر کھلی رائے دے گا جس کا ہر ہر لفظ نوٹ کیا جائے گا۔ اس بڑے گروپ کے مشاورتی اجلاسوں میں اگر وقت کی قید سے اجتناب کیا جائے تو بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔

ب۔ اگلی سطح پر ماہرین کا ایک چھوٹا گروپ تشکیل دیا جائے گا جس کا انتخاب اس بڑے گروپ سے ہی ہوگا اور اس چھوٹے گروپ میں بڑے گروپ میں شامل سب لوگوں کی مناسب نمائندگی ہوگی۔ یہ چھوٹا گروپ سکیم آف سٹڈیز اور نصاب کا مجموعی ڈھانچہ تیار کرے گا اس

مشاورت، ان آراء اور ان نکات کی روشنی میں جو پہلے قدم کے اجلاسوں میں سامنے آئیں گے۔

ج۔ اس کے بعد مضمون وار کمیٹیاں بنائی جائیں گی۔ ہر کمیٹی میں مضمون کے اعلیٰ ماہرین کے ساتھ متنوع علاقوں سے بلائے گئے کلاس روم ٹیچرز اور کم از کم ایک ماہر نفسیات ہوگا جو متعلقہ مضمون کا جماعت اول سے لے کر جماعت دہم تک مرحلہ وار تفصیلی نصاب تیار کریں گے۔

د۔ مضمون وار تفصیلی نصاب تیار کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ سکیم آف سٹڈیز اور نصاب کے مجموعی ڈھانچے (Curriculam Frame Work) پر ابتدائی بڑے گروپ کی ایک اور مشاورتی اور جائزاتی میٹنگ ہو جس میں ابتدائی سفارشات کی روشنی میں سکیم آف سٹڈیز اور نصابی ڈھانچے کا جائزہ لیا جائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو، تبدیلیاں کر دی جائیں۔

ھ۔ مضمون وار اور جماعت وار نصاب تیار ہونے کے بعد بہتر ہوگا کہ قومی اتفاق رائے کی خاطر ابتدائی بڑے گروپ کی مشاورتی میٹنگ کی جائے اور اس کی آراء کی روشنی میں جہاں جہاں ضرورت ہو، امپرووومنٹ کی جائے۔

و۔ کریکولم ڈویلپمنٹ کے اس سارے پراسیس کو سپروائز کرنے کے لیے ایک گروپ ہوگا جو ضروری دفتری اور انتظامی سہولیات مہیا کرے گا۔

ز۔ نصاب سازی کا یہ سارا عمل مقامی ماہرین، مقامی زبان یعنی اردو میں سرانجام دیں گے۔ اگر نصاب سازی کا عمل انگریزی میں کیا گیا تو یہ سارا عمل جعلی، سطحی اور قومی مفادات کے منافی ہو کر رہ جائے گا۔ جس لارجر گروپ کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے اس کے اجلاسوں کے دوران اگر کوئی شریک محفل اپنی کسی مقامی زبان میں اظہار خیال کرنا چاہے تو اس کی نہ صرف اجازت ہوگی بلکہ حوصلہ افزائی کی جائے۔ دوسروں کے استفادے کے لیے ان صاحب کی باتوں کی ترجمانی کی جائے۔

ح۔ کریکولم ڈویلپمنٹ پروسیس میں دو مرحلے بڑے اہم ہوتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک مرحلہ ہے ضروریات کا تعین ( Need

Assessment) یعنی جس سطح کا ہم نصاب تیار کر رہے ہیں اس سطح کے طلباء کی نظریاتی، نفسیاتی، سماجی، معاشی اور ماحولی ضروریات کیا ہیں تاکہ نصاب سازی کے ذریعے ان ضروریات کا حصول ہو سکے۔ دوسری اہم بات پائلٹ سٹڈی یعنی نصاب کے نفاذ کا آزمائشی مطالعہ ہے۔ نصاب عملاً نافذ کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ اسے چھوٹی سطح پر عملاً کلاس روم میں نافذ کر کے دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہے؟ اور اگر کوئی نفاذی مشکلات ہیں تو کیا ہیں تاکہ انہیں بروقت دور کیا جا سکے۔

ط۔ اساتذہ بھی نصاب کا حصہ ہوتے ہیں لہٰذا نصاب سازی کے ساتھ اساتذہ کی تعلیمی تربیتی ضروریات کا تعین بھی کیا جائے اور ان کے دوران ملازمت تربیتی پروگرام بھی تیار کیا جائیں۔

ی۔ نصاب کمیٹی کی یہ ذمہ داری بھی ہو کہ وہ کلاس روم میں نصاب کی مؤثر ڈیلیوری کے لیے ضروری تعلیمی بصری سامان اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ضروری سپورٹ کا اہتمام بھی کرے۔

ک۔ چونکہ ہمارے ملک میں طلباء کے سماجی، معاشی اور خاندانی پس منظر میں بہت فرق ہے۔ ان میں شہروں کے متمول علاقے، کچی بستیاں، مڈل کلاس گھرانے، دیہاتی علاقے، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور خیبر KP کے دور دراز پس ماندہ علاقے، دور دراز ڈیروں، ڈھوکوں، گوٹھوں میں قائم آبادیاں اور سکول شامل ہیں، اس لیے نصاب میں اتنی لچک ہونی چاہیے کہ وہ سب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس کے لیے تجویز یہ ہے کہ ہر مضمون اور ہر جماعت کے لیے کم از کم حصولِ علم کی سطح (MLL) یعنی Minimum Learning Levels اور زیادہ سے زیادہ حصولِ علم کی سطح Maximum Learning Levele طے کر دی جائیں۔ امتحان اور سرٹیفکیشن کم از کم حصول علم کی سطح کے مطابق ہو تاکہ کم ترقی یافتہ علاقوں کے بچے مقابلہ میں نقصان میں نہ رہیں۔

ل۔ ہر طرح اور ہر سطح کے نصابی کتابچے لازماً اردو میں ہوں تاکہ کلاس روم ٹیچر کے ساتھ تعلیمی نگران بھی نصاب کی منشاومقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکیں نیز درسی کتب میں تنوع ہو اور اضافی مطابق مواد بھی طلباء کو مہیا کیا جائے تاکہ نصاب میں قدر افزائی (Value

Addition) ممکن ہو۔

## پاکستان میں نصاب کے جائزے کے لیے چند معیارات

۱۔نصاب کی ترتیب وتدوین میں اسلامی نظریہ حیات غالب نظریہ کے طور پر شامل ہو۔

۲۔ نصاب سازی کے بنیادی گروپ، کور گروپ اور مضامین کی کمیٹیوں میں علماء کرام، ہر علاقے اور ہر سطح کے اساتذہ کی نمائندگی، ماہرین مضمون، ماہرین تعلیمی نفسیات لازمی طور پر شامل ہوں۔ بیرونی عناصر کے مقامی نمائندوں سے نصابی کمیٹیوں کو پاک صاف رکھا جائے۔

۳۔ نصاب سازی کا پورا عمل صاف شفاف اور ظاہر و باہر ہو۔خفیہ پن کے تصور کی سختی سے نفی کی جائے۔

۴۔ ہر سطح پر نصاب سازی کے دوران جو کام بھی ہو رہا ہو اُسے پبلک کے علم میں رکھا جائے اور تنقیدی آراء اور تجاویز پر مسلسل اور گہری نظر رکھی جائے اور درست تجاویز وتنقید کو نصابی عمل میں شامل کیا جائے۔

۵۔ حتمی نصاب تیار ہونے کے بعد اُسے پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا پر وسیع تشہیر دی جائے اور ایک خاص وقت تک لوگوں کی تنقید اور تبصرے آنے دیے جائیں۔

٦۔ اگر حکومت یکساں قومی نصاب نافذ کرنے میں سنجیدہ ہے تو اگلے دو سالوں کے اندر اندر تمام بیرونی امتحانوں پر پابندی لگائے اور Equivalence کا کام صرف ان طلبہ تک محدود کر دیا جائے جو کسی جائز مجبوری کے تحت بیرون ملک پڑھنے پر مجبور تھے اور مجبوراً ہی بین الاقوامی سطح کے کسی امتحان میں بیٹھے۔

تعلیم و تربیت مولانا زاہد الراشدی

# نفاذِ اسلام میں نظامِ تعلیم کا کردار

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام ایک صحت منداور مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور اس سلسلہ میں قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم سمیت بانیانِ پاکستان کے واضح اعلانات تاریخ کا انمٹ حصہ ہیں جن میں اسلام کے مکمل عادلانہ نظام کے نفاذ اور قرآن وسنت کی بالادستی کو پاکستان کی حقیقی منزل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس نظریاتی ملک کو نمودار ہوئے تقریباً پون صدی کا عرصہ گزرنے کو ہے مگر ابھی تک ہم اسلامی نظام کی منزل سے بہت دور ہیں بلکہ اب تو پاکستان کی نظریاتی حیثیت کو ختم کرنے اور اسے سیکولر ممالک کی صف میں شامل کرنے کے لیے عالمی قوتیں اور ان کی نمائندہ لابیاں پوری قوت کے ساتھ مصروف عمل نظر آتی ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا بلکہ عالم اسلام کے حوالہ سے عالمی قوتوں کے ایجنڈے کا سب سے اہم نکتہ یہی مسئلہ بن گیا ہے کہ پاکستان اور پاکستانی قوم کو ہر قیمت پر اسلامی شناخت اور کردار سے محروم کر کے ویسٹرن سویلائزیشن اور سیکولرازم کی پٹری پر چڑھا دیا جائے تاکہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والا یہ ملک اسلام کی نشاۃ ثانیہ، ملتِ اسلامیہ کی وحدت اور اسلامی فلاحی معاشرے کے احیا کے لیے کوئی کردار ادا نہ کر سکے۔

حالات کا اگر ذرا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں ہمارا ۷۰ سالہ اجتماعی طرز عمل اس ضمن میں عالمی سیکولر قوتوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنا ہے، اس لیے صرف انہی کو الزام دینے اور کوستے رہنے کی بجائے ہمیں اپنے قومی طرز عمل اور کردار کا بھی حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیے اور ان اسباب کا کھلے دل کے ساتھ تعین اور اعتراف کرنا چاہیے جو ہماری قومی زندگی کو اس تذبذب اور دوراہے پر لانے کا باعث بنے ہیں۔ ہم پاکستان کے قیام کے بعد تقریباً پون صدی تک اسلامی نظام کی منزل کی طرف عملی پیش رفت کیوں نہیں کر سکے؟ وقت آ گیا ہے کہ اس سوال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور قوم کا ہر طبقہ گریبان میں جھانک کر اپنے رویے اور کردار میں اس ناکامی کی جڑیں تلاش

کرے تا کہ ہم گزشتہ کوتاہیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی نظام کی منزل کی طرف پیش رفت کر سکیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مناسبت سے نفاذ اسلام کے قومی سفر میں ''نظامِ تعلیم'' کے کردار پر ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ قوموں کی ذہنی نشوونما، فکری ارتقا اور تہذیبی ترقی میں نظام تعلیم کا کردار سب سے اہم اور بنیادی ہوتا ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اپنی پالیسیوں اور ترجیحات کے لحاظ سے نفاذ اسلام کبھی ہمارے نظام تعلیم کے مقاصد میں شامل ہی نہیں رہا۔ اسلامی نظام کے نفاذ میں معاشرہ کے چار طبقات کا کردار سب سے اہم اور بنیادی ہوتا ہے: (۱) مقننہ (۲) عدلیہ (۳) انتظامیہ (۴) اور علمائے کرام۔ آج کے دور میں کسی معاشرہ میں قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی، قوانین کی تطبیق وتشریح، ان پر عملدرآمد اور ان معاملات میں علمی وفکری راہنمائی انہی چار طبقات کا کام ہے۔ اور اگر ہم فی الواقع اسلامی اقدار واحکام کو معاشرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ان طبقات کی تعلیم وتربیت، ذہن سازی اور کام کی نوعیت کے مطابق ان کی تیاری ناگزیر ہے، لیکن ہمارے ہاں صورتحال اس سے قطعی مختلف رہی ہے۔

مقننہ میں جانے والے افراد کی ایک بڑی تعداد اور عدلیہ و انتظامیہ کے تمام افراد ہمارے ریاستی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ہیں جسے عصری نظام تعلیم سے موسوم کیا جاتا ہے، جبکہ علمائے کرام اس پرائیویٹ نظام تعلیم سے گزر کر آتے ہیں جسے دینی مدارس کا نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہمارا قومی المیہ ہے کہ اب تک دونوں نظام ہائے تعلیم نے اپنے تیار کردہ افراد کی تعلیم وتربیت کو نفاذ اسلام کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کی اکثریت کو دین کی ضروری تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جا سکا اور علمائے کرام کی اکثریت آج کے سسٹم اور نظام کو سمجھنے کی استعداد وصلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ طبقاتی بُعد کے ساتھ ساتھ ذہنی منافرت اور فکری انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس سب کچھ کی ذمہ داری ہمارے ان دو نظام ہائے تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تعلیمی نظاموں کے اہداف اور ترجیحات پر نظر ثانی کے ساتھ ساتھ دینی وعصری تعلیم اور عملی واخلاقی تربیت کے تقاضوں کو یکجا کر کے

ایک نظام میں سمو دیا جائے۔

عصری علوم وفنون اور اسلامی تعلیمات کو یکجا کرنے کی سوچ نئی نہیں ہے اور علی گڑھ اور دیوبند کی طرح اس سوچ کی تاریخ بھی کم وبیش سوا صدی کو محیط ہے۔ ندوۃ العلماء لکھنو، جامعہ ملیہ دہلی اور جامعہ عباسیہ بہاولپور کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی اور اب بھی ملک کے مختلف حصوں میں یہ سوچ تجربات کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ ابھی تک اس سوچ کو قومی تحریک کی شکل نہیں دی جا سکی حالانکہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے نظام تعلیم کی ہے جو نئی نسل کو آج کے ضروری علوم وفنون کی مہارت کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات اور دینی واخلاقی تربیت سے پوری طرح آراستہ کر سکے، کیونکہ پون صدی کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ قومی زندگی کی گاڑی انہی دو پہیوں کے توازن کے ساتھ صحیح رخ پر آگے بڑھ سکتی ہے اور اگر ہم ان دونوں پہیوں کا باہمی توازن قائم نہ کر سکے تو قومی زندگی کو لڑکھڑاہٹ کی موجودہ کیفیت سے نکالنا ممکن نہیں ہوگا اور نہ ہی نفاذ اسلام کی منزل تک سفر جاری رکھا جا سکے گا۔

---

# شراب بنانے والی کمپنی کے سپانسرڈ رمضان پروگرام

جب فنکار، اداکارائیں، گلوکار اور فلم سٹار رمضان پروگرامز کے اینکر بنیں گے تو پھر شراب بنانے والی کمپنیاں ہی ان کو سپانسر کریں گی نا!

بھلا کون پوچھے گا؟ یہاں دین کا جس طرح چاہو مذاق اڑاؤ، کس نے روکنا ٹوکنا ہے؟ حالات یہی رہے تو بنک اسلامی تعلیمات کے سود کے حوالے سے پروگرامز، فیشن ڈیزائنرز کمپنیاں پردے کے احکامات والے شوز کرایا کریں گی۔ کس نے پوچھنا ہے جی؟

نیا زمانہ۔۔۔ نئے صبح وشام (محمد عاصم حفیظ)

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

مجوزہ یکساں حکومتی نصاب میں ہیومنزم کی اقدار کو قبول کرنے کا معاملہ

# مسئلہ سوئے نیت کا نہیں، ناقص فہم و شعور کا ہے

بات ہو رہی تھی زشت و خوب کی۔ کہا گیا کہ زشت کو چھوڑنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں اور خوب سے خوب تر کو اختیار کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ چاہے یہ خوب اور خوب تر کسی مخالف فکر تصورِ حیات و کائنات سے کیوں نہ ہو؟ اس سلسلہ میں ایک حدیث سنائی جاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم و دانش کی بات کو مومن کی گم گشتہ دولت قرار دیا کہ وہ جہاں سے بھی ملے لے لینا چاہیے۔

یہ بات بالکل درست ہے لیکن ہماری نظر میں اس کی دو بنیادی شرائط ہیں: پہلی یہ کہ علم و دانش کی بات ہمارے اپنے ذخیرۂ علم و عمل میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ علم و دانش کی بات ہمارے تصورِ خیر و شر سے متضاد نہ ہو۔ اب ہم نظر ڈالتے ہیں آج کے فکر و عمل اور اس سے پیدا ہونے والے رویوں پر۔

آج کل موجودہ حکومت کے سنگل نیشنل کریکولم پر ماہرین تعلیم کی بحث چل رہی ہے جس میں ایک بڑا مسئلہ ویلیوز ایجوکیشن کا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ویلیوز ایجوکیشن کی اساس ہیومنزم پر استوار کی گئی ہے جو ایک ملحدانہ فلسفۂ حیات ہے، جس میں اللہ کا انکار، وحی کا انکار، زندگی بعد موت کا انکار اور آخرت کا انکار اظہر من الشّمس ہے۔ دوسری طرف یہ فلسفۂ زندگی انسانیت کی بات کرتا ہے، انسانی حقوق کی بات کرتا ہے۔ تنوع (Diversity) کو احترام دینے کی بات کرتا ہے اور امن، جمہوریت، اعتباریت، سچائی، انصاف کا فروغ چاہتا ہے، ذمہ دار شہریت اور ماحول کا تحفظ چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب جن لوگوں نے ان اقدار کو ہمارے نصاب تعلیم اور نظامِ تعلیم میں حلول کرنے کا منصوبہ بنایا ہے وہ ہمارے خدشات کے مطابق ہمارے وہ بیرونی سرپرست ہیں جو ہمارے معاشرے کو اسلام کے محور سے ہٹا کر سیکولرزم اور لبرلزم کے محور کے گرد کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مقامی نمائندے بھی ان کے ہم نوا ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی معاشرے میں نظریاتی طور پر نفوذ کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ تعلیم ہے۔اس حوالے سے ہمارے بیرونی سرپرستوں کی کاوش سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ بحث چھڑتی ہے تو کچھ مخلص اور اسلامی ذہن کے معروف ماہرین تعلیم بھی ان کی ہم نوائی کرتے نظر آتے ہیں۔

دلیل ان کی یہ ہوتی ہے کہ مانا ہیومنزم ایک ملحدانہ فلسفۂ حیات ہے لیکن نصابی نظریات میں اس کی ترویج تو ایک خالص تعلیمی مسئلہ ہے اور دنیا میں قبولیت یافتہ نظریہ ہے اس لیے اب اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔دوسرے یہ کہ نصاب تعلیم میں ہیومنزم جن اقدار (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) کے فروغ کی بات کرتا ہے وہ تو اچھی ہیں اور انہیں اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔صوبہ کے پی کے میں متحرک اساتذہ کی اسلامی تنظیم نے تو گروپ ڈسکشن کے بعد باقاعدہ اس کی تحسین کی کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم میں ویلیوز ایجوکیشن کی بات ہورہی ہے۔ اسی طرح بعض دیگر تعلیمی کارکنوں نے ویلیوز ایجوکیشن کی تعریف وتوصیف کی۔

اب ہم آتے ہیں اس معیار کی طرف جس کی ہم نے آغاز میں نشاندہی کی تھی۔ایک یہ کہ کیا یہ سب کچھ ہمارے اپنے پاس نہیں ہے؟ اور دوسرے کیا جس سورس سے یہ اخذ ہورہا ہے کہیں وہ ہمارے اپنے تصورِ حیات سے متضاد تو نہیں؟ اقدار پر نظر دوڑائیں تو اسلامی اقدار ارفع واعلیٰ ہیں اور ان میں وہ سب اقدار بھی موجود ہیں جن کا ذکر ہیومنزم کے تحت کیا جارہا ہے نیز ان کی اثر پذیری، وسعت، اور احاطہ کار ہیومنزم کی اقدار سے کہیں بہتر ہے جبکہ جس تصورِ حیات یعنی ہیومنزم سے حکومتی ویلیوز ایجوکیشن کی اقدار اخذ ہورہی ہیں وہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

یہاں ہم یہ نکتہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں کہ تہذیب مغرب اور الحادی فکر وعمل نے غیر محسوس طریقے سے بڑے بڑے جید اسلامی اذہان کو علمی طور پر مسموم کر دیا ہے اور وہ محض فہم وشعور میں کمی کے باعث یا مطالعہ نہ ہونے کے باعث غیرت وحمیتِ علمی میں نقص کا شکار ہیں اور ان کا اسلامی انٹینا (Antena) غیر اسلامی لہروں کو کیچ کرنے میں ناکام ہے ورنہ ان کے خلوص، اسلام کے لیے دردمندی اور ان کے دین کی سربلندی کے جذبے پر کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح کی ایک اور مثال دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی اور یہ یقین ہوا کہ مسئلہ فہم وشعور کا ہے

ایمانی کمزوری یا ذہنی بد یانتی کا نہیں۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ ہم نے سکولوں کی ایک معروف بڑی اسلامی چین کا ایک تحریکی رسالے کے سرورق کے اندر رنگین اشتہار دیکھا جس میں سکول کی تعلیمی اقدار دی گئی تھیں جو یہ تھیں:

Excellence, Leadership, Respect, Commitment, Responsibility, Citizenship

ہیومنزم کی ذیلی اقدار کی فہرست میں یہ سب اقدار شامل ہیں۔ مزید جب ہم نے مختلف سیکولر غیر اسلامی ممالک کے نظامِ نصاب وتعلیم میں سرکاری طور پر بیان کی گئی اقدار کا کھوج لگایا تو اور اقدار کے ساتھ یہ سب اقدار بھی دریافت ہوئیں۔ ممالک جن کا مطالعہ کیا گیا ان میں بھارت، آسٹریلیا، برطانیہ، فلپائن، ٹوگو، برونڈی، کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا، روانڈا شامل ہیں۔ اب اس مذکورہ سکول سسٹم کے کرتا دھرتا لوگوں پر نظر دوڑائیں تو انہیں سیکولر، لبرل یا ہیومنسٹ ہونا تو درکنار انہیں عام گنہگار مسلمان قرار دینے کا تصور بھی دل میں لانا ایک جرم عظیم نظر آتا ہے۔ ان کی دیانت فکر، ان کی اسلامی حمیت، ان کی فروغِ قرآن وسنت میں دن رات کی کاوشیں اور ان کے زہد وتقویٰ کی گواہی ان کے مخالف بھی دیتے ہیں لیکن لوگوں کو اچھے سکول کے انتخاب کی طرف بلانے کے لیے جن اقدار کو نمایاں کیا گیا ہے اس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ ظاہری سرخی وغازہ سے متاثر ہونے کی کمزوری، تہذیب مغرب کے مطالعہ کی کمی اور فہم وشعور میں نقاہت۔

وفاقی وزارتِ تعلیم کے ایک ذمہ دار اہل کار سے بات ہو رہی تھی کہ ویلیوز ایجوکشن میں ہیومنزم کے الحادی فلسفے کو کیوں آگے بڑھایا جارہا ہے؟ تو موصوف کا جواب یہ تھا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہیومنزم ایک ملحدانہ تصور ہے لیکن ہم ہیومنزم کو فلسفہ تعلیم اور فلسفہ نصاب کے طور پر لے رہے ہیں نہ کہ تصورِ حیات اور نظام زندگی کی نمائندگی کرنے والے علمی اور عملی نظریے کے طور پر۔ اس لیے آپ جمع خاطر رکھیں کہ اس سے نظریۂ پاکستان کو کوئی زک نہیں پہنچے گی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ یہ فکری تضاد کس کمزوری کا نتیجہ ہے؟ اس بات کا کہ نہ تہذیب مغرب کا فہم ہے اور نہ فکر مغرب کا شعور۔ لہٰذا ہم باہر سے تو مسلمان ہیں لیکن مغرب ہمارے دل ودماغ میں گھس بیٹھیے کی طرح کام کر رہا ہے۔ سید سعادت اللہ حسینی امیر جماعت اسلامی ہند نے مارچ میں

علی گڑھ میں ہونے والے ایک سیمینار میں ''اسلام اور عصر حاضر کا چیلنج'' کے موضوع پر کلیدی خطاب پیش کیا۔ اس خطاب میں آپ نے بجا طور پر فرمایا کہ اب اسلام کے حوالے سے مغرب کی طرف سے جو چیلنج ہمیں درپیش ہے وہ دل ودماغ کے اندرونی طور پر متاثر ہونے کا ہے جو بہت خطرناک ہے اور اس کے تدارک کی طرف ہمیں توجہ دینی چاہیے۔ اس کے لیے فوری طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ مغربی تہذیب وفکر اور اس کے ذیلی فلسفوں کی تشریح وتوضیح کر کے عصر حاضر کے علماء کرام، ماہرین تعلیم اور اساتذہ میں فہم وشعور پیدا کیا جائے۔ نیز مغربی مفکرین، اداروں اور ایجنسیوں کی طرف سے مسلمانوں کے دل ودماغ کو متاثر کرنے کی جو سرگرمیاں اور منصوبے چل رہے ہیں ان کا پردہ چاک کیا جائے اور امت مسلمہ کے ذہین لوگوں کو اس صورتِ حال سے خبردار کیا جائے۔

---

# شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں مَیں لیکن

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمالِ صدق ومروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ اُمتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال وجلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں مَیں، لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

فہم دین　　ڈاکٹر محمد امین

## عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج اور
# جدید اسلامی تحریکوں کا کردار

### سید سعادت اللہ حسینی صاحب کے غور وفکر کے لیے چند تجاویز
### ہمیں ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اقامت دین کو نئی تشریح اور تحریک اسلامی کو نئے بیانیے کی ضرورت ہے

## حصہ اوّل

۱۔ 'عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج' کے عنوان سے سید سعادت اللہ حسینی صاحب کا جو مضمون 'زندگیٔ نو' دہلی کے شمارہ اپریل ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا تھا وہ ہم نے 'البرہان' کے شمارہ مئی ۲۰۲۰ء میں طبع کر دیا تھا۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے ہم اُس وقت استدراکاً کچھ عرض نہ کر سکے۔ اب بطور تبصرہ ایک مستقل مضمون نظرِ قارئین ہے۔ پاکستانی قارئین کی سہولت کی خاطر ہم سید صاحب کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے البرہان میں طبع شدہ ان کے مضمون کے حوالے دیں گے۔

۲۔ یہ اتفاق دیکھیے کہ ہم نے سید صاحب کا اسی موضوع پر ایک مضمون 'البرہان' شمارہ دسمبر ۲۰۱۹ء میں 'علماء، سکالرز، محققین اور اسلامی تحریکوں کو درپیش علمی چیلنج' کے عنوان سے شائع کیا تھا حالانکہ اس میں سید صاحب نے اسلامی تحریک کے اہل علم کو مخاطب کیا تھا لیکن ہم نے اسے Generalize کر دیا۔ اِس دفعہ سید صاحب کا مضمون ''عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج'' بظاہر عام مسلمان اہل علم وفکر کو مخاطب کرتا ہے لیکن ہم اسے جدید اسلامی تحریکوں کے حوالے سے زیر بحث لا رہے ہیں۔

۳۔ یہاں سید صاحب کی وہ تقریر بھی ہمارے پیش نظر ہے جو انہوں نے علی گڑھ میں مارچ ۲۰۲۰ء میں ہونے والے سیمینار میں ''تصورِ اقامت دین پر اعتراضات۔ایک جائزہ'' کے موضوع پر کی اور جس میں انہوں نے جماعت اور مولانا مودودیؒ کی فکر کی حمایت کرتے ہوئے مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی کی فکر کا ردّ کیا۔

۴۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے اس مضمون میں جماعت کی فکر کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں اس میں بھارت کی جماعت اسلامی کا تناظر غالب تھا اور شاید پاکستان میں اسلامی تحریک کی تفصیلات ان کے پیش نظر نہیں تھیں جیسے ہم جب مولانا مودودی اور تحریک اسلامی کی بات کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جماعت کا پاکستانی تناظر ہوتا ہے اور بھارت کی جماعت ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی اور نہ ہم اتنی تفصیل سے بھارت کی جماعت کی پالیسیوں کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ پاکستان میں تحریک اسلامی کے احوال ہمارے سامنے ہیں۔

۵۔ ہم اس کی توقع بھی نہیں کرتے کہ البرہان ان کی نظروں سے گزرتا ہوگا یا جدید اسلامی تحریکوں کے بارے میں ہم جو کچھ سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں وہ ان کے علم میں ہوگا۔ تاہم ہماری یہ تحریر اگر ان کے مطالعہ میں آئی تو توقع ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر ان پر واضح ہو جائے گا اور وہ اس پر سنجیدگی سے غور کر سکیں گے۔

۶۔ یہ بھی کہنے دیجیے کہ مَیں ان کے علم و فضل اور اپروچ سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ تحریک میں اتنے وسیع المطالعہ اور وسیع النظر لوگ کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو نظر بد سے بچائے اور حاسدوں کے حسد سے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے، آمین۔

۷۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا وحید الدین خاں اور جاوید احمد غامدی کی فکر پر انہوں نے جو تنقید کی ہے مَیں اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ ان صاحبان کی بات میں اصولاً اگر کوئی وزن تھا بھی تو وہ اسے جس انتہاء تک لے گئے ہیں اس نے ان کے نقطۂ نظر کو نا قابل قبول اور نا گوار بنا دیا ہے۔

۸۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ دو تین بنیادی باتیں جو مَیں پچھلے کئی برسوں سے کہتا آ رہا ہوں، سید صاحب کی اس تحریر سے ان کی تائید ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ مَیں جماعتی نظم سے باہر ہوں اور میرا بات کہنے کا اسلوب مختلف ہے اور چونکہ ہمارے یہاں تحریک میں سوچنے اور اختلاف کرنے کی حوصلہ افزائی کا رجحان نہیں ہے بلکہ اسے مخالفت اور تنقید سمجھا جاتا ہے اس لیے بعض اوقات میرے ہاں بھی ردّ عمل میں کچھ سختی آ جاتی ہے جبکہ سید صاحب جماعت کے اندر کے آدمی ہیں بلکہ بھارت کی جماعت کی قیادت ان کے پاس ہے تو ظاہر ہے وہی بات جب وہ کہیں گے تو ان کا انداز اپنا ہوگا اور لامحالہ میرے اسلوب سے مختلف ہوگا۔

۹۔ پہلی بات جو مَیں کہتا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ کی فکر اپنی عظمت کے باوجود اصلاً مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کا ردّ عمل تھی۔ اس بات کی تائید سید سعادت اللہ حسینی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جب وہ

❁ 'نظام یا تہذیب؟' کے زیر عنوان کہتے ہیں:

''جدیدیت نے دنیا کو نظریات اور نظاموں کی حکمرانی فراہم کی تھی۔قومی ریاست قوت وطاقت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔قومی ریاست کے اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) کا تصور جدید سیاست کا اہم ترین تصور تھا۔ ان حالات میں اسلامی مفکرین نے بجا طور پر ریاست اور سیاسی نظام کو اپنے بیانیہ کا بھی اور اسلامی نصب العین کا بھی اہم ترین عنوان قرار دیا تھا۔''(۱)

❁ 'قانون یا اقدار؟' کے زیر عنوان وہ کہتے ہیں:

''گذشتہ صدی میں قومی ریاست اور اس کا قانونی نظام ایک ہمہ گیر قوت کے طور پر سامنے آیا تھا۔ دنیا کے سامنے یہ سوال سب سے اہم سوال بن گیا تھا کہ جدید دنیا کا قانونی نظام کیا ہو؟ اس وقت ہمارے بزرگوں نے اسلامی شریعت اور اسلام کے قانونی نظام کو وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔''(۲)

❁ 'مذاہب کو مخاطب کرنے کی ضرورت' کے تحت لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی کے تحریکی ڈسکورس میں اصلاً جدید نظریات کو مخاطب کیا گیا تھا۔''(۳)

❁ مغربی فکر و تہذیب کے ردّ میں جدید اسلامی تحریکوں نے جو بیانیہ پیش کیا تھا، سید صاحب کے خیال میں اب اس کی بجائے نئے بیانیے کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

''یہ تہذیبی بیانیہ جہاں عصر حاضر کی سوچ اور رائج طریقوں پر نقد کرے وہیں نئے رجحانات اور طریقوں کی ایجاد و اختراع کا بھی ذریعہ بنے یعنی صرف ردعمل پر مبنی

(۱) البرہان مئی ۲۰۲۰ء میں سید صاحب کا مضمون، صفحہ ۵۳، زیر عنوان 'نظام یا تہذیب؟'

(۲) ایضاً، صفحہ ۵۵، زیر عنوان 'قانون یا اقدار؟'

(۳) ایضاً، صفحہ ۵۵، زیر عنوان 'مذاہب کو مخاطب کرنے کی ضرورت'

(reactive) نہ ہو بلکہ اقدامی (proactive) بھی ہو۔‘‘[۱]

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ بانئ تحریک کی فکر مغربی تہذیب کے افکار کا جواب اور ردِّ عمل تھی۔

۱۰۔ دوسری بات جو ہم کہتے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ُاقامت دین‘ کے الفاظ اپنے لغوی معنوں میں مسلم علمی وادبی روایت میں امت میں عام استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن مولانا مودودی علیہ الرحمہ نے بطور اصطلاح ان کی ایک خاص تعبیر کی جس میں ایک مضبوط اسلامی ریاست اور سیاسی غلبے کے تصور کو بنیادی اور نصب العینی حیثیت دی اور یہ ایک وقتی اجتہاد تھا جو مولانا نے کیا اور اسی کے مطابق انہوں نے دین کی تشریح کی جس سے مخصوص علم کلام تیار ہوا۔ اب حالات بدل گئے ہیں لہٰذا نئے اجتہاد اور اقامت دین کی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔

بالکل یہی بات سید سعادت اللہ حسینی صاحب نے اپنے مضمون میں یوں کہی ہے:

’’جدیدیت نے دنیا کو نظریات اور نظاموں کی حکمرانی فراہم کی تھی۔ قومی ریاست قوت وطاقت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ قومی ریاست کے اقتدار اعلیٰ (sovereignty) کا تصور جدید سیاست کا اہم ترین تصور تھا۔ ان حالات میں اسلامی مفکرین نے بجا طور پر ریاست اور سیاسی نظام کو اپنے بیانیہ کا بھی اور اسلامی نصب العین کا بھی اہم ترین عنوان قرار دیا تھا۔ بدلی ہوئی دنیا میں جبکہ سیاست کے بالکل نئے روپ سامنے آرہے ہیں، نیشن اسٹیٹ کی آہنی دیواریں تیزی سے زمین بوس ہورہی ہیں، افکار ونظریات کے بڑے بڑے نظام معدوم ہوتے جارہے ہیں، اور تجارتی مفادات، ٹکنالوجی کے کرشمے اور تہذیبی قدریں زیادہ تر نئی دنیا کی صورت گری کررہی ہیں، یہ سوال نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اسلامی فکر کی پیشکش کا موثر طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ اقامت دین یعنی مکمل اسلامی زندگی کے خواب میں کیا اب بھی ریاست مرکزی اہمیت کی حامل ہے؟‘‘[۲]

مزید کہتے ہیں کہ:

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۵۴، پیرا دوم

[۲] البرہان مئی ۲۰۲۰ء، سید صاحب کا مضمون، صفحہ ۵۳، زیر عنوان ُنظام یا تہذیب؟‘

''ایک خیال یہ ہے کہ اس بدلے ہوئے دور میں تہذیب اور تمدن پر بہت زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ یعنی ایک ہمہ گیر تہذیبی و تمدنی انقلاب اسلامی جدوجہد کا ہدف بنے اور اس انقلاب کے لیے درکار فکری کمک فراہم کی جائے۔ اسلام کے ایک ایسے تہذیبی بیانیہ کو سامنے لایا جائے جس میں موجودہ دور کے اٹھائے ہوئے تہذیبی اور تمدنی سوالات کا اسلام کی روشنی میں اطمینان بخش حل فراہم کیا جائے۔''[۱]

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ تصور اقامت دین کی تشریح پہلے 'ریاست مرکز' تھی اور سیاسی غلبہ اس کا عنوان تھا جبکہ اِس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اس 'سیاسی بیانیے' کو 'تہذیبی بیانیے' سے بدل دیا جائے۔

۱۱۔　تیسری بات جو ہم عرصے سے کہہ رہے ہیں یہ کہ مولانا مودودی علیہ الرحمہ نے اپنے قیام پاکستان سے پہلے کے اپنے اس موقف سے کہ ''اسلامی نظام یا اسلامی ریاست کے قیام کا طریقہ یہ ہے کہ فرد اور معاشرے کی اسلامی خطوط پر اس طرح تعمیر کی جائے کہ اس کے آخری اور منطقی نتیجے کے طور پر ایک اسلامی ریاست وجود میں آجائے۔[۲] پاکستان بننے کے بعد مولانا علیہ الرحمہ نے پاکستان میں سیاسی جدوجہد اور اس کے ذریعے اسلامی انقلاب کی توقع میں اپنے منہج کو بدل دیا اور 'اسلامی انقلاب بذریعہ سیاسی جدوجہد' کا منہج اختیار کر لیا[۳] اور یوں بالواسطہ طور پر مغربی فکر و تہذیب کے نیشنلزم، قومی ریاست، جمہوریت اور انتخابات کے طریقے کو 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر اپنا لیا جس کے نتیجے میں اسلامی انقلاب تو نہ آیا البتہ مغربی جمہوریت، سیکولرازم، لبرل ازم اور کیپٹل ازم.... کے نتیجے میں پاکستان ایک مغرب زدہ قومی ریاست بن کر رہ گیا اور پاکستان کی اسلامی تحریک ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی اور وہ بھی ناکام۔ لہٰذا مولانا کے اس وقتی اجتہاد پر نظر ثانی کر کے اسے بدلا جانا چاہیے۔

بالکل اسی طرح کی بات سید سعادت اللہ حسینی صاحب نے کی ہے البتہ 'اسلامی معاشیات' کے حوالے سے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۵۳، ۵۴، زیر عنوان 'نظام یا تہذیب؟'

[۲] ملاحظہ ہو مولانا مرحوم کا وہ خطبہ جو انہوں نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ میں دیا جو جماعت کے حلقوں میں ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' کے عنوان سے پمفلٹ کی صورت میں طبع ہوتا آرہا ہے۔

[۳] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء و اسلامی ریاست، ص: ۷۰۴۔۷۰۶، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، طبع ۱۹۶۷ء

''یہ تہذیبی بیانیہ جہاں عصر حاضر کی سوچ اور رائج طریقوں پر نقد کرے وہیں نئے رجحانات اور طریقوں کی ایجاد و اختراع کا بھی ذریعہ بنے یعنی صرف ردعمل پر مبنی (reactive) نہ ہو بلکہ اقدامی (proactive) بھی ہو۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال اسلامی معاشیات کی دی جاسکتی ہے۔ اسلامی معاشیات، اسلام کے انسان دوست اصولوں اور قدروں کو روبہ کار لانے کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔ اسی علی گڑھ میں اسلامی معاشیات کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ بڑی تمدنی تبدیلی کا خواب تھا۔ لیکن اب اسلامی معاشیات دھیرے دھیرے اسلامی مالیات تک محدود ہوگئی اور اسلامی مالیات بھی، اسلام کے معاشی مقاصد کے حصول کا انقلابی ذریعہ بننے کی بجائے، جدید سرمایہ دارانہ معیشت ہی کے آلات و وسائل میں فقہی حیلوں کے سہارے اسلامی پیوند کاری تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اس وقت جو تہذیبی چیلنج درکار ہے وہ اعلیٰ درجہ کی تخلیقی اور اجتہادی سوچ کا تقاضا کرتا ہے۔''[۱]

سید صاحب نے 'اسلامی معاشیات' کے حوالے سے جو بات کی ہے اس کی جگہ اسلامی سیاسیات رکھ لیجیے تو وہ بات پاکستان کی تحریک اسلامی کی سیاسی جدوجہد پر سو فیصد منطبق ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے انہوں نے مثال اپنے ماحول سے دینی تھی جہاں وہ جدوجہد کر رہے ہیں نہ کہ پاکستان، مصر، الجزائر، انڈونیشیا جیسے مسلم ممالک کی اسلامی سیاسی جدوجہد کی۔

۱۲۔ ہم نے اپنے موقف کے حق میں سید صاحب کی تحریر سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں اس سے مقصود تحریک اسلامی پاکستان کی قیادت کو یہ باور کرانا ہے کہ ہماری تجاویز ہوائی باتیں نہیں، نہ انہیں جماعت پر بے ہنگم تنقید اور جماعت کی مخالفت سمجھنا چاہیے بلکہ یہ گہرے علمی وفکری مباحث ہیں جن پر سنجیدہ غور وفکر ضروری ہے ورنہ امیر جماعت اسلامی ہند جیسا ذمہ دار شخص یہ باتیں کیسے کہہ سکتا ہے اور تحریکی فکر پر نظر ثانی کی دعوت کیسے دے سکتا ہے؟

## حصہ دوم

۱۔ عصر حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنج کے حوالے سے سید سعادت اللہ حسینی صاحب کے اس سے ملتے جلتے خیالات پر مبنی مضامین پانچ چھ سال پہلے ترجمان القرآن لاہور میں دو

---

[۱] البرہان مئی ۲۰۲۰ء، سید صاحب کا مضمون، صفحہ ۵۴، آخری پیراگراف

قسطوں میں شائع ہوئے تھے (وہ بھی غالباً 'زندگی نو' سے لیے گئے ہوں گے)۔ ہم نے اس موضوع پر ان کا مضمون 'زندگی نو' سے لے کر 'البرہان' کے شمارہ مارچ ۲۰۲۰ء میں شائع کیا۔ وہاں سے 'تحریک اسلامی' پاکستان [۱] کے جریدے ماہنامہ 'نشور' نے پچھلے ماہ شائع کیا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب سید صاحب نے یہ مضامین اردو میں لکھے ہیں تو ظاہر ہے بھارت پاکستان کے اردو بولنے والے تحریکی حلقے ہی ان کے مخاطب ہیں۔ بھارت میں صورت حال شاید بہتر ہو، ہم پاکستانی حوالے سے ہی بات کر سکتے ہیں جو ہمارے براہِ راست مشاہدے میں ہے کہ ان کا حالیہ مضمون (جس پر ہم تبصرہ کر رہے ہیں) جس تخلیقی اور وژنری (Visionary) ذہن سے لکھا گیا ہے (ہم نے روایتی دینی حلقوں کی متوقع ناپسندیدگی کی وجہ سے 'اجتہادی' کا لفظ عمداً استعمال نہیں کیا، اس کو سمجھنے والے، اس کی قدر کرنے والے اور اسے صحیح سمجھ کر اس پر عمل کی خواہش رکھنے والے افراد پاکستان کے تحریکی حلقوں میں شاید اتنے ہی ہوں جتنے انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ اس میں نہ کسی کی تحقیر ہے نہ مخالفت اور نہ مبالغہ بلکہ اس زمینی حقیقت کے کئی اسباب ہیں:

ایک تو یہ کہ تحریکی قیادت زیادہ تر جماعت کی طلبہ تنظیم سے آتی ہے۔ وہاں جو آدمی اچھی تقریر کر سکتا ہو، میل ملاپ رکھتا ہو، کچھ تنظیمی صلاحیت رکھتا ہو او پر آ جاتا ہے۔ میٹنگیں، جلسے جلوس، تقریریں، دورے یہ مصروفیتیں اکثر ان کی علمی صلاحیتوں کی بڑھوتری میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ جماعت میں آنے کے بعد سیاسی جدوجہد کی دن رات کی مصروفیت انہیں گھیر لیتی ہے لہٰذا مطالعہ کی وسعت، فکری گہرائی، علمی بڑھوتری، اور غور و فکر کی عادت پنپنے کا موقع ہی نہیں پاتی۔ جہاں تک تحریکی حلقوں میں عمومی علمی و فکری ماحول کا تعلق ہے اس کی نمو کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔ پاکستان میں تحریکی لوگوں کے ہزاروں سکول، بیسیوں کالج اور تین یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ سب کمرشل ادارے ہیں کہ پاکستان میں تعلیم بدقسمتی سے مالِ تجارت بن چکی ہے لہٰذا تحریکی لوگوں کے تعلیمی ادارے اسلامی علم و فکر اور دعوت و اصلاح کو فروغ دینے کی بجائے بدقسمتی سے مغربی فکر و تہذیب کی اقدار اور مائنڈ سیٹ کو فروغ دے رہے ہیں۔ تھنک ٹینک اور تحقیقی ادارے بھی موجود نہیں، جو ایک آدھ ہے وہ غیر فعال ہے۔ کراچی کا ادارہ البتہ کچھ متحرک ہے

[۱] وہ جماعت جو مرحوم نعیم صدیقی نے جماعت اسلامی سے الگ ہو کر قائم کی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کفایت نہیں کرتا اور مطلوبہ معیار وہاں بھی مفقود ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والی دو سرگرم تنظیمیں (ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی 'تنظیم اسلامی' اور نعیم صدیقی مرحوم والی 'تحریک اسلامی') بھی فعال ہیں لیکن ان کا علمی وفکری ماحول بھی دگرگوں ہے۔ اس علمی انحطاط کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فکری اختلاف کی بناء پر ۱۹۵۶ء میں جماعت سے اہل علم کا ایک بڑا گروہ نکل گیا۔ جماعت کی تنظیمی جکڑ بندی جو لوگ اندر ہیں ان کو بولنے نہیں دیتی اور جو لوگ باہر ہیں (لیکن ہمدرد یا متفق ہیں اور صاحب دانش اور صاحب الرائے ہیں) ان کو اندر نہیں آنے دیتی۔ اور باہر بیٹھے لوگوں کو سننے کا (خواہ وہ ہمدرد اور متفق ہی کیوں نہ ہوں) کا رواج بھی نہیں ہے بلکہ ہماری طرح کے لوگ مخالف سمجھتے جاتے اور معتوب گردانے جاتے ہیں۔ حالانکہ عقل کا تقاضا ہے کہ اختلاف کرنے والے اہل دانش کو، خواہ وہ روایتی ہمدرد نہ بھی ہوں بلکہ نقاد ہوں، انہیں بھی سنا جائے بلکہ ان سے مکالمہ کیا جائے اور جہاں مناسب ہو، ان سے استفادہ کیا جائے کہ دانش مومن کی گم شدہ میراث ہوتی ہے، جہاں سے بھی ملے وہ لے لینی چاہیے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا کہ تحریک اسلامی پاکستان میں اس کا رواج ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں تحریک میں قحط الرجال کی اس صورت حال کی ایک بڑی فکری وجہ وہ بھی ہے جسے ہم اس مضمون کے حصہ سوم میں بیان کریں گے یعنی Zp pzzzzp YYAZY ûZUŒD# LeŒdz bZÞ وَيُزَكِّيْهِمْ کی اساس پر اصلاح وتعمیرِ فرد کو اپنی بنیادی پالیسی کا حصہ نہ بنانا۔

۲۔ ہماری ان گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مضمون میں سید سعادت اللہ حسینی صاحب کی پیش کردہ تجاویز ان کی گہری بصیرت اور خردافروزی پر مبنی ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا تحریکی حلقوں میں ایسا ماحول موجود ہے کہ ان کی تجاویز پر غور وخوض کیا جاسکے؟ ہمارا کہنا یہ ہے کہ کم از کم پاکستان میں ایسا ماحول موجود نہیں ہے، اللہ کرے بھارت میں ایسا ماحول موجود ہو اور اس پر پیش رفت ہو سکے! یہ بھی مناسب ہوگا کہ وہ اس تحریر کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ کرائیں اور امت کی سطح پر موجود اسلامی تحریکوں اور مسلم اہل علم تک اپنی آواز پہنچائیں تاکہ اس موضوع پر سوچ بچار کا آغاز ہو سکے۔

## حصہ سوم

سید صاحب نے اقامت دین کے 'سیاسی مرکز' بیانیے کو بدل کر اسے 'تہذیبی بیانیے' میں بدلنے کی جو تجویز پیش کی ہے، وہ صائب ہے اور ہم اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک وہ جزوی اور توسیع طلب ہے۔ عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مسلم اہل علم وفکر اور جدید دینی تحریکوں کو جس تین نکاتی بیانیے کی ضرورت ہے وہ ہماری رائے میں یہ ہے:

i۔ [illegible] کے الٰہی فرمان اور انبیاء کرام کو دیے گئے طریق کار یعنی اصلاح وتعمیرِ فرد کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کرنا۔

ii۔ مغربی فکر وتہذیب کو اصولی طور پر ردّ کرنا جو الحاد کی داعی اور مذہب مخالف خصوصاً اسلام مخالف ہے اور اس تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک بلاشک وشبہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

iii۔ تہذیبی ایشو کو نئے بیانیے کی بنیاد بنانا جس کا ذکر سید صاحب نے کیا ہے۔

اب ہم ان تینوں نکات کی کچھ وضاحت کریں گے تاکہ ہمارا نقطۂ نظر سید صاحب پر اور قارئین پر واضح ہو سکے۔

### ا۔ [illegible] کے اصول کو اپنے لائحہ عمل میں شامل کرنا

دیکھیے جناب! تہذیب اور اجتماعیت کی بنیا فرد ہوتا ہے۔ کسی مخصوص فکر وعمل کے حامل افراد جمع ہوں تو ہی ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔ یوں کوئی تہذیب قائم ہو نہیں سکتی اور ہو جائے تو قائم رہ نہیں سکتی جب تک وہ ایسا فرد تیار نہ کرے جو اس کے فکری اور عملی تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں چار دفعہ یہ ذکر کیا ہے[۱] کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا طریق کار [illegible] ہے یعنی تعلیم کتاب

---

[۱] البقرہ ۲:۱۲۹۔ البقرہ ۲:۱۵۱۔ آل عمران ۳:۱۶۴۔ الجمعہ ۶۲:۲

وحکمت اور تزکیۂ نفس اور یہ بھی جا بجا بتایا کہ پہلے پیغمبروں کا طریق کار بھی یہی تھا[۱]۔

تعلیم کتاب وحکمت کے الفاظ سے ہمارے ذہن میں آج کل ریگولر تعلیم کا تصور ابھرتا ہے جبکہ قرآن حکیم نے اس کے لیے دعوت، تبلیغ، انذار، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مقصود سب سے ہے افراد تک دین کی دعوت اور دین کی تعلیم پہنچانا۔ تزکیۂ نفس سے مراد یہ ہے کہ تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ عمل میں ڈھلتی جائے۔ اس کو آج کل کی اصطلاح میں تعمیر شخصیت، تعمیر سیرت اور کردار سازی کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ افراد تک دین کی دعوت وتعلیم اس طرح پہنچائی جائے کہ وہ اس پر عمل کرنے لگیں یعنی اس کا نتیجہ ہو ایمان اور عمل صالح۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری زندگی یہی کام کیا اور اسی کے نتیجے میں اتنے افراد تیار ہوئے کہ اسلامی معاشرہ بھی وجود میں آ گیا اور اسلامی ریاست بھی۔

تحریکی قیادت نے ظاہر ہے اس بنیادی دینی تصور اور ضرورت کا انکار تو نہیں کیا لیکن مغربی تہذیب کی سیاسی بالادستی کے ردّعمل میں اس نے جس اجتماعی سیاسی تبدیلی اور اسلامی ریاست کے قیام کو ہدف بنایا اس کے نتیجے میں بالواسطہ طور پر اس بنیادی ضرورت وتصور پر ترکیز نہ ہو سکی اور اس کا حق ادا نہ ہو سکا بلکہ اس سے کچھ صَرفِ نظر ہو گیا۔

ہماری رائے میں یہی خامی تحریک کے سیاسی اہداف کی کامیابی میں بھی رکاوٹ بنی کیونکہ جب تک آپ افراد تک دین کی دعوت اور اپنے تصور دین کی دعوت اتنے بڑے پیمانے پر نہ پہنچائیں کہ وہ آپ کے حامی بن جائیں وہ فاسق وفاجر قیادت کی تبدیلی اور اسلامی انقلاب کی حمایت میں آپ کا ساتھ کیوں دیں گے؟ یہ تقریباً وہی بات ہے جو بانیٔ تحریک نے علی گڑھ میں ۱۹۴۰ء والے خطاب میں کہی تھی کہ اسلامی حکومت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب آپ افراد اور معاشرے میں پہلے مطلوبہ تبدیلی لائیں۔

حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ تحریکی بیانیے پر بلاشبہ نظر ثانی (Rethinking) کی ضرورت ہے لیکن اس نظر ثانی کے وقت پچھلے ۷۸ سال کے تجربات کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق سیکھنا بھی ضروری ہے جس کا ایک تقاضا ہماری رائے میں یہ ہے کہ

---

[۱] طٰہٰ ۲۰: ۴۳، ۴۴۔ الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹۔ النازعات ۷۹: ۱۷، ۱۸

[illegible] اور تعمیر واصلاحِ فرد کو تحریک کے نئے بیانیے میں بنیادی جگہ دی جائے۔

### ۲۔ مغربی فکر وتہذیب کا اصولی ردّ

ہر عہد کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور ہمارے عہد کا فتنہ اور چیلنج مغربی فکر وتہذیب ہے۔ دو تین صدیوں کی غلامی اور اس کے بعد استعمار کے چولا بدل کر مسلمانوں کو فکری وعملی غلام رکھنے کی پرامن کامیاب کوششوں کی وجہ سے ہمارے حکمرانوں، دانشوروں، ادیبوں، صحافیوں کی ایک بڑی تعداد ان سے مرعوب ومتاثر ہوگئی ہے۔ علماء واسلامی مفکرین کی ایک بڑی تعداد ان کے ردّ عمل کا شکار ہوئی ہے اور بعض ان سے مرعوب ومتاثر ہوکر تجدد کے راستے پر چل پڑے ہیں۔

بانیٔ تحریک کی فکر کے مغرب کے جدید نظریات کا ردّ عمل ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے ذہن میں مغربی فکر وتہذیب کے الحاد کا اور اس کے نقیضِ اسلام ہونے کا تصور بالکل واضح تھا۔ تنقیحات کے زوردار مضامین اس کے گواہ ہیں۔ تشکیل جماعت کے وقت ارکان کے لیے انگریز سرکار کی ملازمت اور اس کی عدالتوں سے استفادہ نہ کرنے کی شرط بھی اسی رجحان کی مظہر تھی لیکن پاکستان بننے کے بعد ان کی رائے بدل گئی۔ وہ سمجھے کہ حالات ایسے ہیں کہ سیاسی جدوجہد سے پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن سیاست ان کے ہاتھ میں نہ تھی بلکہ مغرب اور مغرب زدہ حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھی لہٰذا انہیں سیاسی میدان میں 'اسلامی' کردار ادا کرنے کے لیے اسلام اور مغربی جمہوریت کو ملا کر 'اسلامی جمہوریت' کا معجون مرکب بنانا پڑا۔ تقریباً پون صدی تک اس منہج پر عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست پر مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار غالب آگئے ہیں اور اسلام صرف کاغذوں میں باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ کہانی صرف پاکستان کی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کی ہے اور عالم اسلام کی ساری اسلامی تحریکوں کی ہے۔

لہٰذا ہمارے ممدوح سید صاحب اگر جدید اسلامی تحریکوں کے لیے اقامت دین کے 'ریاست مرکز' بیانیے کی جگہ 'تہذیب مرکز' بیانیہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کی حمایت کریں گے کیونکہ 'ریاست مرکز' بیانیہ کے بارے میں اگر ہم یہ نہ بھی کہیں کہ وہ ناکام ہوگیا ہے تو بہر حال یہ بسہولت کہا جاسکتا ہے کہ اس کی افادیت ختم ہوگئی ہے اور جو کچھ وہ دے سکتا تھا وہ دے

چکا ہے لہٰذا اب جدید اسلامی تحریکوں کے لیے نیا منہج اور نیا بیانیہ ضروری ہے۔لیکن ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اس نئے بیانیے کا ایک بنیادی اصول یا جزو یہ ہونا چاہیے کہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کو اصولی طور پر ردّ کر دیا جائے۔اور اس کے فکری ردّ کے لیے وسیع لٹریچر تیار کیا جائے اور ایک بھرپور مہم کے ذریعے ایسی علمی وفکری فضا تیار کی جائے جس میں مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کرنے والے علماء، دانشور اور نوجوان تیار ہوں اور اسلامی فکر و تہذیب ایک قابل عمل متبادل کے طور پر سامنے آئے اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب پر ایسی مضبوط علمی وفکری تنقید کی جائے کہ اسے انسانیت کے لیے غیر مفید بلکہ نقصان دہ ثابت کر دیا جائے۔

### ۳۔تہذیبی بیانیہ

اب آتے ہیں سید صاحب کے اس 'تہذیب مرکز' بیانیے کی طرف جسے وہ 'ریاست مرکز' بیانیے کی جگہ لانا چاہتے ہیں۔کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس طرح بانیٔ تحریک کا 'ریاست مرکز' بیانیہ اپنے عہد کے مغربی افکار کا ردّ عمل تھا، اسی طرح سید صاحب ممدوح کا 'تہذیبی بیانیہ' بھی ہمارے عہد کے مغربی مفکرین (برنارڈ لوئیس اور سیموئل ہنٹنگٹن وغیرہ) کے افکار کی بازگشت ہے جنہوں نے مذہب کی بجائے تہذیبوں کو بنیادی اہمیت دے کر تہذیبی کشمکش کا نظریہ پیش کیا اور اسی نظریے کو مغرب اس وقت بنیاد بنا کر اپنی ساری پالیسیاں وضع کر رہا ہے خصوصاً اسلام اور مسلمانوں کے خلاف۔لیکن اس کے باوجود ہم ان کی اس تجویز کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ یہ تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے اور تالاب کے کھڑے پانی میں پتھر پھینکنے کی طرح ہے، اس گزارش کے ساتھ کہ اس میں ہمارے (سطور بالا میں بیان کردہ) دو نکات بھی شامل کر لیے جائیں۔

سید صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے چار مظاہر کا ذکر کیا ہے:

i۔ دین کو (سیاسی) نظام کی بجائے تہذیب کے طور پر پیش کیا جائے۔

ii۔ اقامتِ دین بذریعہ نفاذِ قانون کی بجائے اسلامی اقدار پر عمل۔اس کا تلخ تجربہ ہم پاکستان میں کر چکے ہیں۔ یہاں تحریک برسوں مطالبہ کرتی رہی کہ قانون اسلامی ہونا چاہیے۔ جنرل ضیاء الحق نے ایسا کر دیا تو اس اپروچ سے ہوا نکل گئی کیونکہ ۱۹۷۹ء میں حدود قوانین

پاس ہوئے اور آج تک ایک حد پر بھی عمل نہیں ہوا۔اسی طرح تحریک برسوں 'اسلامی نظام تعلیم' کا مطالبہ کرتی رہی لیکن جب قانوناً اسے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت مل گئی تو اب اس کے پاس ہزاروں سکول، بیسیوں کالج اور تین یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب کچھ موجود ہے سوائے اسلامی اقدار کے۔

iii۔ **روحانی تسکین:** پاکستان میں تحریک نے تصوف کی سخت مخالفت کی (اس کے غیر اسلامی پہلوؤں کے ہم بھی مخالف ہیں) لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ تزکیۂ نفس سے بھی تغافل برتا جائے۔ اس تغافل کے نقصانات کی ایک طویل فہرست ہے۔ سید صاحب نے بالکل ٹھیک کہا کہ اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ہم مئی کے ترجمان القرآن میں سید سراج الحسن مرحوم (سابق امیر جماعت) پر سید صاحب ممدوح کا مضمون پڑھ کر حیران رہ گئے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اہل خانہ سمیت دعا کرانے ان کے پاس گئے اور لوگ ان سے باقاعدہ دَم اور رقیہ کرانے آتے تھے۔ پاکستان کی تحریک اسلامی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

iv۔ **مذہب کو مخاطب کرنے کی ضرورت:** ہم سمجھتے ہیں کہ آج بھی اسلام کا مقابلہ مغربی فکر وتہذیب سے ہے اور اہل مغرب بھی اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اسی لیے اسلام اور مسلمان ان کا ہدف ہیں۔ ہماری رائے میں مسیحیت اور یہودیت وغیرہ سے اسلام کی کشمکش اس شدید نوعیت کی نہیں ہے کہ یہ اسلامی تحریکوں کے مجوزہ بیانیے کا اہم عنصر بن سکے۔ غالباً سید صاحب کا ذہن بھارت کے خصوصی حالات کی وجہ سے اس طرف گیا۔تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم مذاہب کو زیر بحث ہی نہ لائیں۔انہیں لازماً زیر بحث لانا چاہیے اور دنیا کے سامنے یہ بات رکھنی چاہیے کہ اسلام جیسا صحیح مذہب (دین) ہی ان کے سارے مسائل کا حل ہے۔

اپنے مضمون کے آخر میں انہوں نے نئے افکار، نئے نظریات اور نئے آئیڈیاز کی بات کی ہے۔اس کے لیے جو چیز ناگزیر ہے وہ ہے اختلاف رائے کو برداشت کرنا، کریٹیکل تھنکنگ (Critical Thinking)، ریسرچ کا ماحول اور نئے آئیڈیاز کی حوصلہ افزائی۔ بدقسمتی سے اکثر اسلامی تحریکوں میں اختلاف رائے برداشت نہ کرنے، روایت پرستی بلکہ قائد پرستی اور جمود کے رجحانات جڑ پکڑ چکے ہیں اور حالت بقول اقبال یہ ہو چکی ہے کہ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

پاکستان اور بھارت کی تنظیموں میں حالات اور پالیسیوں کا جو اختلاف ہے، وہ بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

## آخری بات

سید صاحب کے 'تہذیبی بیانیے' کی حمایت کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنے جو دو نکات پیش کیے ہیں، بظاہر ہمارے ممدوح سید صاحب کے لیے انہیں سمجھنا اور انہیں وزن دینا آسان نہیں لگتا اس لیے کہ ان کی ساری فکری تربیت فرد کی بجائے اجتماعیت کو اہمیت دینے کے بیانیے کے تحت ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقامت دین بذریعہ 'ریاست مرکز' بیانیہ کی بجائے وہ جو 'تہذیب مرکز' بیانیہ دینا چاہ رہے ہیں وہ بھی اجتماعیت ہی کو ہدف بنانے کی ایک شکل ہے.... لیکن اپنی تحریروں میں وہ ہمیں جتنے ذہین وفطین، وسیع المطالعہ اور وسیع المشرب لگے ہیں، اس کی بناء پر ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری گزارشات پر غور ضرور کریں گے اور انہیں Appreciate ضرور کریں گے۔ نیز ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ ہماری تجاویز کے لیے ان کا سینہ کھول دے۔

بہر حال اس سے قطع نظر کہ وہ ہماری تجاویز مانیں یا نہ مانیں، یہ بہت اہم ہے کہ جو بات انہوں نے چھیڑی ہے اس پر بحث کی جائے۔ اسے اردو کے ساتھ عربی اور انگریزی میں بھی پیش کیا جانا چاہیے تا کہ عالمی اسلامی تحریکیں اس پر غور کر سکیں۔ لوگ اس کی حمایت یا مخالفت میں سوچیں اور لکھیں کہ موجودہ جمود کی کیفیت بہر حال ختم ہونی چاہیے۔ امام حسن البناؒ اور سید مودودیؒ کی عظمت کو سلام! لیکن وہ پیغمبر نہ تھے لہٰذا آج جب ان کی حکمت عملی کو گزرے ستر اسّی برس ہو چکے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی اختیار کردہ حکمت عملی کے نفع نقصان کا کھاتہ کھول کر اس کا آڈٹ کیا جائے۔ پانی کھڑا رہے تو بو دینے لگتا ہے اور جمود کوئی حل نہیں ہوتا لہٰذا ماضی میں اختیار کردہ حکمت عملی کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث ہونی چاہیے اور ضرورت ہو تو آج نئی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے.... جیسا کہ کل بانیانِ تحریک نے کی تھی۔ هذا من عندنا والعلم عند الله.

فہم دین

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

# علماء کرام اور فتنۂ تصویر

آج ہمارے علماء کرام اور دین دار طبقہ میں ایک گناہ بہت زیادہ کیا جارہا ہے اور وہ ہے موبائل کے ذریعہ تصویریں بنانے کا شوق، اور وہ بھی اللہ کے گھر میں، مساجد، مدارس اور دینی تقریبات میں۔ حد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کعبۃ اللہ کو پیٹھ کر کے لوگ تصویریں بنا رہے ہوتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو غصہ نہیں آئے گا؟ اللہ ان کو اپنے گھر سے دفع نہیں کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آئے گا کہ جاؤ نا! تم اتنے ناپاک ہو گئے ہو کہ ہمارے گھر میں آنے کے قابل نہیں رہے۔ اور دوسری طرف ہمارے دینی مدارس اور مساجد میں قرآنی تقریبات اور ختم بخاری کی تقریبات بڑے دھوم دھام، فخر ومباہات اور اسراف وتبذیر کے ساتھ ہو رہی ہیں، جو بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ رہی ہیں اور انہی دینی تقریبات اور روحانی محافل میں جو اللہ تعالیٰ کے گھر (مساجد) میں جہاں رحمت کے فرشتوں کا بسیرا ہوتا ہے، قرآن کریم اور احادیث موجود ہوتی ہیں، لیکن ہمارے علمائے کرام، طلبہ اور دین دار لوگوں کی دھڑا دھڑ موویاں بن رہی ہوتی ہیں، لائیو پروگرام نشر ہو رہے ہوتے ہیں، تصویریں اور فوٹو گرافی ہو رہی ہوتی ہے اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں۔ اس منکر کے خلاف کوئی کھل کر مخالفت نہیں کرتا، تو اب اللہ تعالیٰ کا غضب اور قہر نازل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

ہمارے علماء کرام اور مفتیانِ عظام کو چاہیے کہ وہ بیٹھ کر متفقہ طور پر یہ بات طے کریں کہ کم از کم دینی تقریبات، خصوصاً قرآن کریم، ختم بخاری کی تقریبات کو اس گناہِ بے لذت سے پاک رکھیں اور مساجد میں فوٹو اور تصویر کھینچنے اور مووی بنانے کو ناجائز، حرام اور گناہ قرار دیں، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کم ہوگی اور اس طرح کی وبائیں، امراض، آفات اور مصائب وآلام رُک جائیں گے۔ اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے گھروں کا اکرام نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے گھروں سے ہمیں نکال دیں گے۔ ولا فعل اللہ ذلك. [بینات، کراچی]

فہم دین

ڈاکٹر محمد امین

# ہمیں نیا اسلام نہیں چاہیے

ہم سمجھانا چاہتے ہیں ان مسلمانوں کو جن کی آنکھیں مغربی فکر وتہذیب کے غلبے، اس کی دنیاوی ترقی اور اس کی سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت کی چکا چوند سے خیرہ ہو رہی ہیں کہ ہمیں مغربی فکر وتہذیب کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اسلام کو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ڈھالنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمیں دنیا وآخرت دونوں میں ترقی اور کامیابی کے لیے اس پرانے اسلام کی ضرورت ہے جس نے ہمیں ماضی میں دنیا میں بھی عزت وعظمت دی۔ ۴۰ سال کی عمر میں جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ایک فرد تھے۔ ۲۳ سال بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہوا تو ہزاروں لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔

عہد صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ کے تقریباً ۲ سال، حضرت عمرؓ کے عہد کے ۱۲ سال اور حضرت عثمانؓ کے عہد کے نصف اوّل کے ۶ سال یعنی ۲۰ سال سے بھی کم عرصے میں مسلمان دنیا کے بڑے حصے پر غالب آ چکے تھے۔ اس وقت کی دو ورلڈ پاورز روم اور ایران ان کے قدموں میں تھیں۔ اس کامیابی کا منبع ایمانی قوت تھی۔ پھر میرٹ پر ترقی کا یہ سفر جس میں علم وتحقیق اور سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت بھی شامل تھی، اگلے ۱۲۰۰ سال تک جاری رہا۔

کیا یہ کامیابی کے ماڈل نہیں؟ ہمیں دنیا میں کامیابی وترقی کے لیے کسی نئے اور جدید ماڈل کی کیا ضرورت ہے؟ نہیں جناب! ہمارا دنیا میں ترقی وکامیابی کا پرانا ماڈل کامیاب تھا اور یہ امت کا ذاتی تجربہ ہے، کوئی قصہ کہانی نہیں۔ لہٰذا Old is Gold۔ آیئے! آزمائیں پرانے نسخے کو جس نے ہمیں پہلے بھی شفا دی تھی۔ ہمیں نیا نہیں پرانا اسلام چاہیے۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد والا۔ ابوبکر وعمر وعثمان وعلی (رضی اللہ عنہم) کے عہد والا۔ وہی پرانا اسلام، جس میں قوت کا منبع ایمان تھا، ہر مرض کا علاج ہے، ہمارے ہر دکھ کا مرہم ہے۔ ضرورت اس بات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے۔ یا لیت قومی یعلمون.

فہم دین

ڈاکٹر محمد زبیر (ابوالحسن علوی)

# 'انجینئر محمد علی مرزا۔افکار ونظریات'

[یہ اس موضوع پر ڈاکٹر زبیر صاحب کی کتاب کا مقدمہ ہے جو ہم قارئین کی معلومات کے لیے شائع کر رہے ہیں۔مدیر]

جنوری ۲۰۱۹ء کے وسط میں راقم الحروف اپنے تین دوستوں کے ساتھ مرزا صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے ادارے جہلم گیا تھا، دوران ملاقات کچھ گفتگو بھی ہوئی۔ مرزا صاحب سے ملاقات ہمارے ایک دوست عاصم مغل صاحب کے توسط سے ہوئی تھی اور اس ملاقات کے لیے انہیں تین ماہ کھپنا پڑا۔ ہم نے مرزا صاحب سے درخواست کی تھی کہ ہم آپ سے بحث کے لیے نہیں آنا چاہتے، ہم آپ سے آپ ہی کی تحریر ''واقعہ کربلا کا حقیقی پس منظر: ۲۷ صحیح الاسناد احادیث کی روشنی میں'' پر چند سوال کرنے آئیں گے اور ان کا جواب سننا چاہیں گے اور ہم اس سوال جواب کی گھنٹہ بھر کی نشست کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو مرزا صاحب نے کہا کہ سوال پہلے لکھ کر بھیج دیں۔ خیر ایک مہینہ پہلے انہیں سوالات لکھ کر بھیج دیے گئے اور ایک مہینہ پہلے ایک بچے کو بھی آپ پانچ سوالات پکڑا دیں تو وہ بھی تیاری تو کر لے گا لیکن حیرت ہوئی کہ مرزا صاحب نے دوران ملاقات صاف انکار کر دیا کہ کون سے سوالات؟ کیسے سوالات؟ بس ایک سوال کرنے کی آپ کو اجازت ہے اور اس کی بھی آپ ریکارڈنگ نہیں کر سکتے جبکہ ہمارے ایک ساتھی اپنا کیمرہ لے کر گئے ہوئے تھے بلکہ ساتھ ہی مرزا صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ میں سے کسی نے اس گفتگو کی آڈیو ریکارڈنگ بھی کی تو اللہ کے ہاں گریبان پکڑ لوں گا۔ تو یہ تو ان کا خوف کا عالم ہے۔

باقی مختلف سوشل میڈیا کے گروپس میں ان کے جو میسجز گھومتے رہتے ہیں کہ مرزا صاحب علماء سے ملاقات کے لیے تیار ہیں، جنہوں نے ملنا ہے تو اس ای میل یا ان فون نمبرز پر رابطہ کریں تو یہ سب ڈھکوسلا ہے، یا مہذب الفاظ میں اس کو مارکیٹنگ کہتے ہیں اور عام لوگ اس قسم کے میسجز کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے اہل علم سے ملاقات سے گھبرانے کی وجہ جو ان سے ملاقات کے بعد سمجھ آئی ہے، وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب واقعی میں کسی صاحب علم کے

سامنے دومنٹ نہیں بیٹھ سکتے۔ ابویحییٰ نور پوری صاحب اتنے عرصے سے مرزا صاحب پر نقد کر رہے ہیں اور خوب علمی نقد کر رہے ہیں، ان کی ویڈیوز دیکھ کر ہزاروں لوگ مرزا صاحب کو سننا چھوڑ رہے ہیں۔ نہ مرزا صاحب ان کو جواب دے رہے ہیں، اور نہ ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بیٹے آصف حمید صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا کہ مرزا صاحب اہل تشیع کے ہاں ان کے مدارس کا وزٹ کرنے آتے ہیں تو آپ ان سے مل کر آئے ہیں، اگر ہمارے ہاں بھی آجائیں تو ان سے کچھ موضوعات پر تبادلہ خیال بھی ہو جائے اور وہ ہمارے ادارے قرآن اکیڈمی اور تنظیم اسلامی وغیرہ کے مرکز کا دورہ بھی کر لیں اور مل بیٹھ کر کھانا وانا بھی کھالیں۔ تو میں نے عاصم مغل بھائی کے ذریعے مرزا صاحب کو پیغام بھجوایا تو یہ جواب موصول ہوا کہ آپ کو تو پتہ ہے کہ مرزا صاحب کہیں جاتے نہیں ہیں حالانکہ ابھی کچھ دن پہلے ہی وہ مولانا طارق جمیل صاحب اور اہل تشیع کے ایک مرکز کا دورہ کر کے لوٹے تھے۔ تو ہمارے دوست عاصم مغل صاحب جو کافی عرصہ مرزا صاحب سے متاثر رہے، اس پر کافی حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ میں انہیں مخلص سمجھتا تھا لیکن ان سے واسطہ پڑنے پر معلوم ہوا کہ یہ صریح جھوٹے لوگ ہیں اور یقین نہیں آرہا کہ یہ ایسی دوغلی پالیسیوں کے حامل ہیں کہ جہاں انہیں کچھ دنیاوی مفاد نظر آتا ہے وہاں چل پڑتے ہیں اور جہاں کسی علمی گفتگو یا کام کی بات کا ماحول ہو تو وہاں سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

ابھی بھی اگر مرزا صاحب کے کسی فالوور کا یہ خیال ہے کہ ہماری بات غلط ہے اور مرزا صاحب تو اہل علم سے ملاقات کے لیے بہت گرم جوش ہیں تو بھئی مجھے آپ مرزا صاحب سے وقت لے دیں، جہاں کہیں گے، دوبارہ آجاؤں گا، لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ پروگرام فیس بک لائیو چلے گا اور میں صرف اور صرف ان کی تحریر پر سوال اٹھاؤں گا، کوئی بحث نہیں کروں گا، البتہ اب کی بار سوال پہلے لکھ کر نہیں بھیجوں گا۔

چلیں، اس میں حرج نہیں کہ آپ کو نہیں آتا لیکن دوسری طرف جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں کسی بھی عالم دین کی صَرف نحو کی غلطیاں نکال کر دکھا سکتا ہوں تو اس جھوٹ پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جھوٹ نہ بولیں تو کوئی آپ کو ناواقفیت کا ٹیگ نہیں لگائے گا لیکن جب آپ اپنے آپ کو نابغۃ العصر اور حضرت العلام ثابت کرنے میں لگ جائیں گے اور باقی سارے تو شاید آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھنے کے قابل ہیں تو پھر لوگ آپ کو آپ کی حیثیت بتلائیں گے۔

جب آپ خود اِل میزڈ (Ill mannered) ہوں گے اور صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کریں گے، علماء اور مولویوں کو خوب رگڑا لگائیں گے، ہر کسی کو کھری سنائیں گے، تو لوگ آپ کو آپ کی اوقات بجا طور یاد دلوائیں گے اور پھر آپ کو برا لگے گا حالانکہ یہ سارا محاذ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے خود کھولا ہوا ہے لہٰذا بند بھی آپ کو ہی کرنا ہے۔

بہر حال ہم نے مرزا صاحب کے اس رویے سے مایوس ہو کر ان کے کتابچے ''واقعہ کربلا کا حقیقی پس منظر: ۲۷ صحیح الاسناد احادیث کی روشنی میں'' پر تقریباً ۱۸ گھنٹے کی ویڈیوز ریکارڈ کروائیں اور انہیں اپنے یوٹیوب چینل پر اپ لوڈ کر دیا کہ جس کا لنک کتابچے کے آخر میں ہم نقل کر رہے ہیں۔ بعض دوستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بعض مقامات پر بحث گہری ہو جاتی ہے لہٰذا اس کو پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے تو ان ویڈیوز کو تحریری صورت دے دیں۔ تو اسی غرض سے ویڈیو کے اس مواد کو تحریری صورت میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہ کتابچہ اس سلسلے کی پہلی قسط ہے۔ اس کے بعد دوسری قسط بھی شائع ہو گی، ان شاء اللہ عزوجل۔ مرزا صاحب اپنے اس کتابچے کو اپنا بنیادی ترین فکر بتاتے ہیں بلکہ ان کے بقول یہ کتاب ان کی ''دی بیسٹ پراڈکٹ'' ہے اور وہ اسے علماء کے خلاف ''ہائیڈروجن بم'' قرار دیتے ہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے جو ویڈیوز تیار کی تھیں تو اس کے جواب میں مرزا صاحب کے فالوورز بلکہ بعض ساتھیوں کی طرف سے بھی بہت کچھ گالم گلوچ سننے کو ملا حالانکہ ہم نے ویڈیو میں شاید ہی کوئی ایک جملہ بھی ایسا بولا ہو جو مخاطب کے لیے قابل اعتراض ہو سکتا تھا۔ بعض دوستوں کا کہنا یہی ہے کہ واسطہ پڑنے پر معلوم ہوا ہے کہ یہ بدمعاشوں کا ٹولہ ہے جن کا کام علماء اور مذہبی طبقات کو محض لعن طعن کرنا، گالم گلوچ دینا اور ان کی شخصیت کو مسخ کرنا ہے۔ خیر اس بات کا تو مَیں بھی گواہ ہوں کہ جتنی گندی زبان مرزا صاحب علماء کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، الامان والحفیظ۔ مجھ سے ملاقات کے دوران حضرت صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ علماء مجھ پر بھونکتے ہیں۔ اب بھلا کوئی شریف آدمی ایسے گفتگو کرتا ہے۔ خیر وہ تو یہ بھی کہہ دیں گے کہ مجھے شریف مت سمجھو اور انہوں نے ہم سے ایسی باتیں کی بھی تھیں۔ بھئی جب آپ علماء کو ناصبی کہو گے تو وہ جواب میں آپ کو رافضی ہی کہیں گے، اور کیا کہیں گے! تو انہوں نے تو رافضی بھی نہیں کہا، صرف نیم رافضی کہا ہے، یہ بھی ان کا بھلا ہے کہ آپ کا لحاظ کیا ہے اور آپ نے

تو ان کو پکا ناصبی کہنا شروع کر دیا ہوا ہے بلکہ جب ان کا آپ سے ذرا اختلاف ہوتا ہے، آپ اس پر ناصبی کے فتوے لگانا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کی وہ ویڈیو آج بھی سوشل میڈیا پر آن دی ریکارڈ ہے جس میں آپ نے یہ کہا تھا کہ پاکستان کا کوئی ایک مدرسہ ایسا دکھا دیں جہاں مولوی کو حجرے میں منہ کالا کرنے کے لیے بچے میسر نہ ہوں اور آپ کے یہ الفاظ کہ مَیں ان مولویوں کی شلوار اتار کر ان کے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

تو یہ کچھ گفتگو اس لیے کر دی کہ مرزا صاحب اور ان کے ساتھیوں کو مسکین بننے کا بڑا شوق ہے کہ ہمیں یہ کہہ دیا، ہمیں وہ کہہ دیا، بالکل محلے کے اس بچے کی طرح جو گلی میں ہر بچے سے چھیڑ خوانی کرنے کے بعد کُٹ کھا کر گھر آ جاتا ہے اور ماں کو شکایتیں لگاتا ہے کہ مجھے فلاں نے مارا ہے لیکن یہ نہیں سوچتا کہ جس نے مارا ہے، اس نے جواباً مارا ہے اور انہیں بھی یہ سوچ نہیں آتی۔

رہی بات مرزا صاحب کے کتابچے کی تو مرزا صاحب کے اس کتابچے کے چھ مصادر ہیں: احادیث مبارکہ جو صحیح ہیں، احادیث مبارکہ جو ضعیف ہیں، مرزا صاحب کا احادیث کے تراجم میں بریکٹس کی صورت میں اضافے کرنا، مرزا صاحب کا احادیث کے مفاہیم میں انحراف کے لیے سطحی اور بے کار قسم کے حواشی اور فٹ نوٹس لگانا، مرزا صاحب کا تاریخ کی کتابوں سے حوالے نقل کرنا، مرزا صاحب کا بابوں کو حوالہ بنانا۔ تو مرزا صاحب کی یہ فکر ان چھ چیزوں سے مرکب ہے جس میں صحیح وضعیف احادیث، مرزا صاحب کی من مانی تاویلات اور بابوں کے وہ اقوال جو مرزا صاحب کی فکر کو اسپورٹ کرتے تھے، آ گئے ہیں۔

یہ تو مرزا صاحب کے مصادر ہوئے اور جہاں تک اس کتابچے کے موضوع کی بات ہے، تو یہ کتابچہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جس کے ۳۲ صفحات ہیں اور ان میں دو ابواب یعنی ۱۷ صفحات بالخصوص جبکہ بقیہ ابواب میں بھی روایات کی بڑی تعداد حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق ہے جنہیں مرزا صاحب نے کھینچ تان کر، کبھی بریکٹس کی صورت ترجمے میں مذموم اضافے کر کے، اور کبھی گھٹیا قسم کے فٹ نوٹس لگا کر حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں ہر مثبت بات کو بھی منفی بنا دیا ہے۔ یہ کتابچہ واقعہ کربلا کا پس منظر کم اور حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف چارج شیٹ زیادہ معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کتابچے کا صحیح عنوان ’’حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف چارج شیٹ‘‘ ہی بنتا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے تئیں، اس امت میں پیدا ہونے والے ہر فساد کی جڑ حضرت امیر معاویہؓ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تو واقعہ کربلا کا حقیقی پس منظر بیان کرتے کرتے چھ میں سے پانچ ابواب تو مرزا صاحب نے حضرت امیر معاویہؓ پر لگا دیے اور آخر ایک باب میں یزید کا تذکرہ کر دیا تو گویا واقعہ کربلا کا یہ طویل پس منظر ذکر کر کے مرزا صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کربلا میں ہونے والے ظلم عظیم کے اصل ذمہ دار یزید کم اور ان کے والد محترم زیادہ ہیں جو اس وقت دنیا میں تھے ہی نہیں، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اور یہ سارا کتابچہ آپ پڑھ لیں تو اسے پڑھ کر یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ لوگ کربلا کا الزام یزید کو دیتے ہیں حالانکہ اصلاً تو اس الزام کے حقدار تو ان کے والد محترم تھے جنہوں نے وہ ساری بیک گراؤنڈ بنائی تھی اور جس کی وجہ سے کربلا کا سانحہ ہوا۔

اب یہ بد یانت اور خائن لوگ کس طرح سے وہ حدیثیں جو اپنے مفہوم میں عام ہیں، کھینچ تان کر امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام پر چسپاں کرتے ہیں! ایک طرف انہیں رضی اللہ عنہ لکھ رہے ہیں اور صحابی مان رہے ہیں، دوسری طرف ان کی گردن اڑانے کو جہاد قرار دے رہے ہیں۔ بس ان کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ فلاں صحابی رسول ہے، لہٰذا اس کی گردن اڑانے سے پہلے بس ''رضی اللہ عنہ'' پڑھ لینا تا کہ پورے ادب اور احترام سے گردن اڑائی جا سکے، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اور یہی کام مرزا صاحب اور ان کے فالوورز کر رہے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کو معاذ اللہ، شرابی، حرام خور، سود خور، بدعتی، باغی اور واجب القتل ثابت کرنے کے لیے پورا زور لگانے کے بعد بس استدعا یہ کر رہے ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ ماننے اور کہنے سے پہلے ان کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' پڑھ لیا جائے۔ **فیا للعجب۔**

مرزا صاحب نے اپنے ریسرچ پیپر المعروف ہائیڈروجن بم ''واقعہ کربلا کا حقیقی پس منظر'' میں جا بجا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھی صحابہ کرام کا گروہ، باغی گروہ تھا۔ اور وہ صرف انہیں باغی کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے کتابچے کے پانچویں باب بعنوان ''حضرت معاویہؓ کو حکومت مل جانے کے بعد بتدریج اس امت پر کیسی ملوکیت مسلط ہوئی اور اس کا بھیانک نتیجہ کیا نکلا؟'' میں، ص ۲۵ پر صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد کچھ نالائق لوگ جانشین بنیں گے، وہ زبان سے جو کہیں گے وہ کریں گے نہیں اور جو ان سے ہاتھ سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے، جو ان سے زبان سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے اور جو ان سے دل سے جہاد کرے گا تو وہ مومن ہے اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

تفہیم مغرب　　　　محمد دین جوہر {۱}

# کیا مغربی تہذیب قرآنی اصولوں پر مبنی ہے؟

## جو تہذیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفرت پر کھڑی ہو وہ اسلامی یا قرآنی نہیں ہو سکتی

ہمارے ایک دوست نے گزشتہ دنوں یہ سوال اٹھایا کہ کیا اہل مغرب نے اپنے علم، معاشرے اور تہذیب کے بنیادی اصول قرآن مجید سے حاصل نہیں کیے؟ ہم اپنے زوال کی وجہ سے جس ذمہ داری کو فراموش کر چکے ہیں، اہل مغرب نے اسے پورا کر دکھایا ہے؟

یہ سوال دراصل جواب ہے۔ ہمارے کلچر، تعلیم، علوم، مذہبی مباحث، فکری انتاجات اور دینی تعبیرات میں یہ بات بہت عام ہے۔ ہمارے ہاں اسے ایک مرکزی سچ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے کہ اہل مغرب نے جو یہ جدید تہذیب کھڑی کی ہے اسے انہوں نے قرآن مجید سے اخذ کیا ہے۔ متجددین (ماڈرن مسلم اسکالرز مثلاً جاوید احمد غامدی وغیرہ) اور جدید تعلیم یافتہ مذہبی لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مغرب نے سائنس کے اصول بھی قرآن مجید سے اخذ کیے ہیں۔ جہاں تک مغرب کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ یہ بھی انہوں نے قرآن مجید سے اخذ کیے ہیں۔ مغربی علوم کے بارے میں بھی ہمارے ہاں یہی دعویٰ ہے کہ اہل مغرب نے قرآنی تعلیمات پر "تحقیق" اور اس کی ہدایات پر عمل کر کے علوم کا حصول ممکن بنایا ہے۔ یہ بات اب تداول کا درجہ اختیار کر چکی ہے کہ "ہمارے ہاں مسلمان تو ہیں، اسلام نہیں ہے اور مغرب میں اسلام ہے، مسلمان نہیں ہیں"۔ ہمارے ایک دوست جو مذہبی تعلیم یافتہ ہیں گزشتہ دنوں کئی ماہ تک یورپ گھوم کے واپس آئے تو ان کا فرمان بھی شنیدنی تھا۔ فرمانے لگے کہ مجھے وہاں جا کے احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ہم سے جو مطالبات کیے ہیں، ہم تو اس کے صرف مخاطب ہی ہیں، ان پر عمل تو مغرب نے کر کے دکھایا ہے۔

اب یہ ایک مقبولِ عام "علمی بصیرت" ہے کہ اہل مغرب نے اسلام کی مرادات کے عین

---

{۱} دانشور، معلم، مدیر "جی"

مطابق ایک معاشرہ اور تہذیب کھڑی کی ہے جسے انہوں نے قرآن مجید سے اخذ کیا ہے اور ”یہ تہذیب اور معاشرہ مکمل اسلامی ہے اور اب صرف کلمے کی کسر رہ گئی ہے باقی سارا کام تیار ہے“۔

یہ بات بھی بہت عام ہے کہ مغرب جو بھی نئی دریافت کرتا ہے ہمارے ”پڑھے لکھے“ لوگ، جو اب میڈیا اور سیاست کی معاشی اور ثقافتی ضروریات کی وجہ سے ہم پر پوری طرح مسلط ہو چکے ہیں، ہمیں فوراً یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ یہ سائنسی حقیقت تو پہلے ہی قرآن مجید میں موجود تھی اور اہل مغرب نے ”ریسرچ“ کر کے اسے قرآن مجید سے نکال لیا ہے۔ اس معاملے میں بھی مسلمانوں نے بڑی کوتاہی برتی اور وہ قرآن مجید سے سائنسی حقائق دریافت نہ کر سکے جو اس میں پوشیدہ تھے۔ گویا قرآن مجید ایک ایسی کان ہے اور اہل مغرب اس کے اسرار و رموز کے ایسے واقف اور غواص ہیں کہ وہ تعلیم، علم، ٹیکنالوجی اور ہر قسم کے معاشی اور سیاسی نظام وغیرہ اس سے اکثر نکالتے رہتے ہیں۔ مسلمان بیچارے قرآن مجید پڑھتے تو بہت ہیں لیکن وہ گوہر مراد انہیں ہاتھ نہیں آتا جو مغرب والوں کو مل جاتا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی کوتاہی اور بدنصیبی کا ایک اور پہلو بھی سامنے آ جاتا ہے کہ ان کی فہم بھی نہایت ناقص ہے۔ گویا کہ ان کی بدنصیبیاں پہلے ہی کیا کم تھیں کہ ایک اور آ کھڑی ہوئی!

گزارش ہے کہ محولہ بالا قضایا کی نوعیت ”علمی“ بھی ہے اور ”مذہبی“ بھی۔ ان کی علمی حیثیت کے تعین کے لیے انہیں کسی علمی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی مذہبی معنویت کے لیے ایک دینی تناظر درکار ہے۔ فی الوقت ہم ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے، عام تجربے کی سطح پر، اس ”موقف“ کے صرف ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کے ہاں یہ ”علمی“ نتائج اور مذہبی ادراک اس دوئی سے پیدا ہوا ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک اور قرآن مجید کے مابین کچھ خاص تاریخی حالات میں ہماری کوتاہ نظری سے پیدا ہوا ہے۔ ہماری جدید تعبیر و تفسیر پر تاریخی مؤثرات غالب آنے کی وجہ سے اس طرح کے موقف اب عام ہو گئے ہیں۔ جب مسلمان بہت جوش سے محولہ بالا مواقف

کو آگے بڑھا رہے ہوتے ہیں، اس وقت وہ دراصل اس بات کا اعلان اور اعتراف کر رہے ہوتے ہیں کہ ایک ایسا تصور حیات، ایک ایسا معاشرہ اور ایک ایسی تہذیب جس کے فکری، سماجی اور تاریخی علوم میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی (نعوذ باللہ) تحقیر، تغلیط اور توہین کو صدیوں سے مرکزی حیثیت حاصل ہے، وہ عین قرآن مجید کے مطابق ہیں۔ یعنی ایک ایسا معاشرہ جس کے سماجی اور تاریخی علوم کی لائبریریاں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) کردارکشی پر مبنی "تحقیقی کتابوں" سے پٹی پڑی ہیں، جن میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی (نعوذ باللہ) توہین کو ایک انسٹی ٹیوشن اور مستقل ثقافتی قدر کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے (نعوذ باللہ) کارٹون بنانا اظہار آزادی کی علامت بن چکا ہے، اور جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) توہین کو ایک ثقافتی میلے اور فیسٹیول کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، وہ معاشرہ عین قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق تشکیل دیا گیا ہے! مغرب کے سماجی اور تاریخی علوم کا منہج اور غایت بار بار اس لیے بدل دی جاتی ہے کہ اسلام کے ماورائی ہونے کا انکار کیا جا سکے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک کو (نعوذ باللہ) ایک غیر تاریخی اور افسانوی شخصیت ہونے کا کوئی "علمی" ثبوت لایا جا سکے (جیسا کہ وہ عیسیٰ یسوع مسیح کے بارے میں کر چکے ہیں) اور ہم انہی علوم کو قرآن مجید سے اخذ شدہ قرار دینے پر بضد ہوتے ہیں! اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اہل مغرب نے اپنا سارا علم اور معاشرہ قرآن مجید ہی کی روشنی میں تشکیل دیا ہے تو اس سوال کا جواب واجب ہے کہ قرآن مجید کی وہ کون سی تعبیر ہے جس کی بنیاد پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہوئی ہے جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ نہ صرف یہ کہ غیر متعلق اور غیر اہم ہے بلکہ آپ ﷺ کی (نعوذ باللہ) توہین کو ایک مرکزی ثقافتی اور علمی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ نہایت بدقسمتی اور محرومی کی بات ہے کہ کوئی مسلمان دین کا ایسا تصور رکھتا ہو جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات پاک کو مرکزیت حاصل نہ ہو، یا وہ دین کا ایسا فہم رکھتا ہو جس کی توسیط جدید فکر کے انکاری ذرائع سے ہوئی ہو، یا وہ علم کا کوئی ایسا تصور رکھتا ہو جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وجودی تعلق کی نسبتیں غیر اہم ہوگئی ہوں، یا وہ کردارِ انسانی کا ایسا نمونہ سامنے رکھتا ہو جہاں اسوۂ حسنہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہو۔ کم از کم ایک بات تو واضح ہے کہ

مغربی معاشرے اور تہذیب کو دیکھنے کی مذکورہ "قرآنی نظر" کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات مبارکہ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا اور نہ اس ہدایت سے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں عطا فرمائی۔ قرآن مجید سے اس طرح کے نتائج صرف اس وقت نکالے جا سکتے ہیں جب یہ مستشرقین (Orientalists) اور متجددین (Modernists) کے محاصرے میں ہو اور اس سے ہر طرح کی علمی، اخلاقی اور روحانی "ٹرمز آف سرینڈر" پر دستخط کرا لیے گیے ہوں۔ عصر حاضر کے "علمی" ذرائع اور "فکری" گھیراؤ اس قدر طاقتور ہیں کہ کوئی متن، بھلے وہ مذہبی ہی کیوں نہ ہو، بول نہیں سکتا، اسے بلوایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک علمی اور تفصیل طلب موضوع ہے۔

اگر عصری دنیا کو دیکھنے کا محولہ بالا فہم ہمارے ہاں قرآن مجید سے حاصل ہوا ہے تو ہمیں قرآن مجید کی بجائے اپنے فہم اور عقل کو از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں وہ عین باطل کی مرادات پر ڈھلنے کے بعد قرآن مجید پر دھاوے کے مغربی عمل میں شریک تو نہیں؟ کیا ہمارا شعور و عمل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے وفائی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا؟ کیا ہم نے جدید (Modern) بننے کی دوڑ میں اس تعلق پر سمجھوتے تو نہیں کر لیے؟ اقبالؒ نے خوب کہا تھا کہ ؂

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند[۱]

جدید مغربی تہذیب، جیسا کہ اس کے علم، کلچر اور میڈیا سے ظاہر ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی دشمن تہذیب ہے اور عین اسی تہذیب کے بارے میں یہ موقف رکھنا کہ اس کے اصول و مبادی قرآن مجید سے اخذ کیے گئے ہیں، انتہائی نادانی کا موقف ہے۔ اس جدید "قرآنی" موقف کو رد کرنے کے لیے یہی پہلو کافی ہے لیکن جدید علمی اور فکری رویوں کے غلبے اور دھونس کی وجہ سے ان کا تجزیہ بھی آج ایک دینی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیے۔

---

[۱] پاژند: پارسیوں کی مذہبی کتاب، اور اس کی تفسیر

کرونا ڈاکٹر محمد امین

# کرونا ۔ سچ کیا ہے؟

* اہل دانش غور کریں کہ یہ قدرتی وبا ہے یا بایولوجیکل وارفیئر ہے اور دنیا پر غلبے اور نفوذ کی جنگ ہے۔
* مغرب زدہ سعودی حکومت کے فیصلے کو رد کر کے پاکستان کے علماء کرام متحد ہو کر فیصلہ کریں کہ عید کی نماز ضرور ہوگی

کرونا کے بارے میں معلومات کے لیے ہم نے ۱۴ مئی ۲۰۲۰ء کو ورلڈ ہیلتھ آرگنائیزیشن (WHO) کی ویب سائٹ سے رجوع کیا تو مندرجہ ذیل معلومات ملیں (ظاہر ہے یہ اوپن ڈیٹا ہے اور ہر آدمی اس سائٹ کو کھول کر یہ معلومات حاصل کرسکتا ہے):

## دنیا

دنیا کی کل آبادی (2019ء کے اعداد و شمار کے مطابق) 7,713,468,100 (یعنی تقریباً پونے آٹھ ارب ہے)۔ دنیا میں شرح اموات 7.579 فی ہزار سالانہ ہے۔ 2019ء میں 5,84,60,374 (پانچ کروڑ 84 لاکھ) اموات ریکارڈ کی گئیں یعنی 48,71,697 (48 لاکھ 71 ہزار) ماہانہ یا 1,60,165 (ایک لاکھ 60 ہزار) روزانہ۔ 10 مئی 2020ء تک کرونا سے اموات کی تعداد 2,97,000 تھی یعنی پچھلے ڈھائی ماہ میں اوسطاً 1,18,800 اموات ماہانہ۔

پھر نوٹ کیجیے کہ دنیا میں روٹین میں ماہانہ 48,71,697 (48 لاکھ 71 ہزار) اموات ہوتی ہیں جن میں کرونا کی وجہ سے 1,18,800 (ایک لاکھ 18 ہزار) کا اضافہ ہوا۔

## پاکستان

WHO کے مطابق 2019ء میں پاکستان کی آبادی 21,65,65,318 تھی (یعنی 21 کروڑ 65 لاکھ)۔ یہاں شرح اموات 6.934 تھی یعنی ماہانہ 1,23,424 (ایک لاکھ 23 ہزار) اموات یا روزانہ 4,114 اموات۔

پاکستان میں کرونا سے 10 مئی تک 761 اموات ہوئیں یعنی تقریباً 304 اموات ماہانہ۔یعنی ایک لاکھ 23 ہزار ماہانہ روٹین کی اموات میں محض اوسطاً 304 کا اضافہ ہوا۔

## سعودی عرب

سعودی عرب کی آبادی 2019ء میں 3,42,68,528 (تین کروڑ 42 لاکھ) تھی۔ یہاں شرح اموات 3.513 تھی یعنی سالانہ 1,20,385 (ایک لاکھ 20 ہزار) اموات یا ماہانہ 10,032 اموات۔

یہاں کرونا کی وجہ سے 10 مئی تک 273 اموات ریکارڈ ہوئیں یعنی ماہانہ واسطاً 109 آدمی کرونا سے فوت ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں دس ہزار روٹین کی ماہانہ اموات میں محض 109 اموات کا اضافہ ہوا۔

اب ذرا اِس خوف، اس اضطراب، اس افراتفری، اس پینک (Panic) کا اندازہ کیجیے جو پھیلایا گیا۔لاک ڈاؤن سے ملکوں کی معیشت اجڑ گئی، انڈسٹری تباہ ہوگئی، لاکھوں کروڑوں افراد بے روزگار ہوگئے اور بھوکے مر رہے ہیں۔امریکہ جیسے ملک میں لوگ داتا دربار کی طرح لائنوں میں لگ کر مفت کھانا حاصل کر رہے ہیں۔

ذرا ایمانی اور روحانی افلاس سے ہونے والے نقصانات کا جائزہ لیجیے کہ ساڑھے تین کروڑ کی آبادی والے سعودی عرب میں حکمرانوں نے محض 109 اموات کی وجہ سے ڈر کر (حقیقت تو اتنی ہی ہے نا! باقی سارے تو محض خدشے، اندازے اور توہمات ہیں) حرمین شریفین کو اور اپنی ساری مساجد کو اجتماعی عبادت کے لیے بند کر دیا۔سعودی عرب کے غلط فیصلے کو مثال بنا کر سارے مسلمان حکمرانوں نے مسجدیں بند کر دیں۔صوبہ سندھ میں تو حکومت نے کرفیو نما لاک ڈاؤن نافذ کر دیا اور مسجدوں کے باہر پولیس کھڑی کر دی کہ کوئی نمازی مسجد میں داخل نہ ہو سکے۔لاہور میں بھی جمعہ کے دن مساجد کو تالے لگا دیے گئے۔ بڑی مشکل سے علماء نے ہمت دکھائی، متحد ہوگئے اور حکومتی پابندیوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ حکومت نے درمیانی راہ نکالی اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ مساجد میں جمعہ وتراویح کی اجازت دے دی۔

اب پھر سعودی عرب کی مغرب زدہ حکومت نے احمقانہ بزدلی دکھائی ہے اور عید کی نماز

پر پابندی لگانے کے لیے ملک بھر میں عید کی چھٹیوں میں کرفیو نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ہے تا کہ کوئی مسلمان عید پڑھنے کے لیے گھر سے نہ نکل سکے۔ ہم اس کی مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ مساجد اور میدانوں میں نماز عید پڑھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ احتیاطی تدابیر پر عمل کی کوشش ہونی چاہیے لیکن جہاں فیکٹریاں، کارخانے، دفاتر، مارکیٹیں، دکانیں، بازار، بنک، پیسے اور راشن تقسیم کرنے کے مقامات کھلے ہیں۔ بازاروں میں عید کی خریداری کا رش ہے، یوم علی (رضی اللہ عنہ) کے جلوس نکل رہے ہیں وہاں سارا ملبہ مسجدوں اور عید جیسی دینی اور معاشرتی عبادت پر ہی نہیں گرنا چاہیے۔ علماء کرام کو چاہیے کہ وہ دوبارہ متحد ہو کر اپنی آواز اٹھائیں اور حکومت پر واضح کر دیں کہ عید کی نماز ہوگی اور لازماً ہوگی۔

ہم اہل دانش سے بھی یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ کرونا کی وجہ سے ہونے والے منظر نامے پر غور فرمائیں کہ دنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اور کون کر رہا ہے؟ یہ محض قدرتی وبا ہے یا بایولوجیکل وار فیئر ہے اور دنیا پر غلبے اور نفوذ کی جنگ ہے جس میں اسلام اور مسلمان بھی پس رہے ہیں اور باہم الزام تراشی چین وامریکا کر رہے ہیں۔


## شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

**زرِاعانت:** سالانہ 500 روپے پانچ سال: 2000 روپے تاحیات: 10,000 روپے

نام.............................................. پتہ..............................................

فون..............................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

ملی مجلس شرعی

# نماز عید پر کوئی ناروا پابندی قبول نہیں کی جائے گی

## ملی مجلس شرعی کے علماء کرام کا متفقہ اعلان

ملی مجلس شرعی جو سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کی مشترکہ علمی و دینی مجلس ہے، اس کے علماء کرام نے فیصلہ کیا ہے کہ نماز عید الفطر اور نمازِ جمعۃ الوداع کے اجتماعات پر حکومت کی کوئی ناروا پابندی قبول نہیں کی جائے گی۔ جب دفاتر، فیکٹریاں، کارخانے، بنک، بازار، مارکیٹیں اور دکانیں کھلی ہوئی ہیں، ہر جگہ رش ہے۔ یوم علی (رضی اللہ عنہ) کے جلوس کی بھی حکومت نے اجازت دی جس میں کوئی پابندی نہیں تھی تو عید کی فرض و واجب نماز پر چھ چھ فٹ کے فاصلے کے ایس او پیز نافذ کرنا بھی ناقابل قبول ہے۔ علماء کرام نے ائمہ وخطبا سے کہا کہ وہ وسیع مساجد اور کھلے پارکوں میں نماز ادا کریں تاکہ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔

اس اعلان کی مولانا زاہد الراشدی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا عبد المالک، حافظ عاکف سعید، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، علامہ ابتسام الٰہی ظہیر، مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، علامہ خلیل الرحمن قادری، مولانا عبدالرؤف ملک، حافظ ڈاکٹر حسن مدنی، مولانا عبداللطیف چیمہ، قاری جمیل الرحمن اختر، مولانا غضنفر عزیز، ڈاکٹر سمیع اللہ فراز، مولانا نعمان حامد، ڈاکٹر علی اکبر الازہری، مولانا عبداللہ مدنی، مولانا محمد عمران طحاوی اور مجلس کے دیگر علماء کرام نے تائید کی۔

ڈاکٹر محمد امین
سیکریٹری جنرل

اسلام اور پاکستان

محمد عاصم حفیظ[۱]

# راجہ داہر کو سندھ کا بیٹا اور قومی ہیرو بنانے کی مہم

دس رمضان المبارک کو نامور سپہ سالار کے راجہ داہر پر حملے اور اس کی ہلاکت کے حوالے سے سوشل میڈیا پر سندھی قوم پرست حلقوں، این جی اوز اور ملک کے سیکولر و لبرل حلقوں کی جانب سے راجہ داہر کو سندھ کا بیٹا قرار دے کر قومی ہیرو بنانے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ یہ پاکستانی سوشل میڈیا کے ٹاپ ٹرینڈز میں شامل ہے۔ ارض پاک میں ہر روز کسی نہ کسی نئے شگوفے کا سامنا ہے۔ کہیں اسرائیل کے جھنڈے اسلام آباد میں نصب ہو رہے ہیں، رنجیت سنگھ کا مجسمہ لاہور لگایا گیا اور اب سندھ میں راجہ داہر کو ہیرو بنانے کی مہم جاری ہے۔

راجہ داہر کو ایک منصف، سندھ کا بیٹا اور کامیاب حکمران کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ جسے ایک بیرونی عرب حملہ آور محمد بن قاسم نے شکست دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ دراصل یہ برصغیر میں اسلام کی آمد کے خلاف دلی بغض، تکلیف اور دکھ کے اظہار کی ایک کوشش ہے۔ اسلام کی آمد پر تنقید کی بجائے محمد بن قاسم کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ راجہ داہر کو ہیرو بنا کر دراصل ایک اسلامی ہیرو کو متنازعہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ سب ایک خاص حلقے کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔ اس مہم کے تحت اپنی مرضی کے تاریخ دانوں کے حوالوں کے ذریعے ایسے تمام واقعات کو ہی جھوٹا قرار دیا گیا ہے جن میں راجہ داہر کے بارے میں منفی تاثر پیدا ہو۔ اس دور میں لکھی گئی کتابوں جن میں راجہ داہر کی جانب سے عرب جانے والے ایک قافلے کی لڑکیوں کو یرغمال بنانے، اپنی بہن سے شادی رچانے اور عوام پر ظلم و ستم کے واقعات درج ہیں، ان سب کو مسترد کر کے موجودہ دور کے ایسے من پسند تاریخ دانوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن میں جی ایم سید وغیرہ شامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ عالمی میڈیا اور کچھ این جی اوز اب یہ مطالبہ شروع کرانے کی کوشش میں ہیں کہ سندھ میں اسلام کے فروغ کا باعث بننے والے محمد بن قاسم کو ولن اور راجہ داہر کو ہیرو بنا کر پیش کیا جائے۔ اس حوالے سے گزشتہ سال سے باقاعدہ

---

[۱] لیکچرر جرنلزم، صحافی، دانشور

تقریبات کا بھی آغاز کر دیا گیا ہے۔ کمال تو یہ بھی ہے کہ راجہ داہر کے تاثر کو مثبت ثابت کرنے اور اسے منصف ورحمدل ثابت کرنے کے لئے تاریخی حوالوں کا تو انکار کیا گیا ہے لیکن محمد بن قاسم اور اس وقت کے مسلمان حکمرانوں کو عیاش اور لالچی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ سندھ پر حملوں کو بھی لالچ اور باہمی چپقلش قرار دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ نو سو سال پہلے کے راجہ داہر، رنجیت سنگھ ہیرو بنائے جا رہے ہیں تو صدیوں اس علاقے پر حکمرانی کرنے والے مسلمان کیوں ہیرو نہیں ہو سکتے؟ کیا آٹھ نو سو سال سے یہاں مقیم مسلمان اتنے عرصے کے بعد بھی مقامی نہیں بن سکے، یا کبھی بھی نہیں بن سکیں گے؟ ان نئے تاریخ دانوں کا مطالبہ ہے کہ ہزار سال پرانے غیر مسلم حکمرانوں کو ہیرو تسلیم کیا جائے جن کے بارے میں مصدقہ تاریخ تک موجود نہیں۔ ان راجوں کے ظلم وستم کی داستانوں کو مسترد کر کے وہ بغیر حوالوں کے نئی تاریخ بنانے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ان کے بعد آنے والے مسلم حکمران ان کے ہیرو کے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے۔ کتنی عجیب منطق ہے کہ راجہ داہر کو ہیرو مانا جائے لیکن اس کے بعد کے سینکڑوں سالوں کی تاریخ کو مسترد کر دیا جائے! اس نفسیاتی مرض کے بارے میں آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟

اگر پرتھوی راج، راجہ پورس، رنجیت سنگھ، راجہ داہر اتنے ہی منصف اور عوام دوست حکمران تھے تو کیونکر عوام تیزی سے مسلمان بھی ہوئے اور آئندہ صدیوں تک مسلمانوں کو نہ صرف حکمران تسلیم کیا، ان کے ساتھی بنے، ان کے ساتھ رشتہ داریاں کیں اور ان کی آنے والی نسلیں مسلمان رہیں بلکہ اس اجنبی دیس میں آج بھی کروڑوں لوگ مسلمان ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب عرب سے تو نہیں آئے۔ ایک بار مسلمان ہونے کے بعد ان لوگوں نے کئی ادوار میں ہندو وسکھ ریاستوں کے باوجود، انگریزوں کے ظلم وستم، مراعات کے لالچ اور بہت سے مواقع پر جب مسلمانوں کی گرفت انتہائی کمزور بھی ہوئی لیکن ان لوگوں نے اپنا دین نہیں بدلا۔ کبھی بھی تاریخ میں راجہ داہر اور رنجیت سنگھ کو ہیرو بنانے کی تحریک نہیں چلی۔ لبرل وسیکولر لکھاریوں کی دلیل کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ تاریخ میں عوام نے کبھی بھی مسلمان حکمرانوں کو غیر اور بیگانہ نہیں سمجھا بلکہ ان سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے اور پھر صدیوں تک مسلمان ہی رہے۔ اگر عرب، افغان، مغل اور ایرانی حملہ آور صرف لوٹ مار کرنے آتے تھے تو پھر یقینا مقامی افراد

میں ان کے خلاف شدید نفرت ہونی چاہیے تھی۔لوگوں نے کیونکر ان حملہ آوروں کا دین قبول کر لیا۔ان کے واپس جانے اور حکمرانی کی گرفت کمزور پڑنے کے باوجود دین نہیں بدلا۔اگر کوئی یہ کہے کہ جبری مسلمان کیا گیا تو پھر کروڑوں لوگ ہندو، سکھ یا بدھ مت کیسے رہ گئے؟ یہ کیسے بچ گئے؟ ہندی فلموں میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ مغلوں کے اور کئی دیگر ادوار میں متعدد ہندو، سکھ ریاستیں بھی موجود تھیں۔لوگوں نے ان ریاستوں میں پناہ کیوں نہ لی؟ بلکہ نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اس پر سختی سے عمل پیرا بھی رہے۔انگریزوں کا دور مسلمانوں کے لئے مشکلات کا دور تھا۔اس میں بھی کبھی راجہ داہر اور رنجیت سنگھ کو ہیرو بنانے اور ان کے مجسمے لگانے کی مہم نہیں چلی۔اس وقت تو کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی۔اس سے بڑھ کر منافقت اور کیا ہوگی کہ ہیرو ماننے کے معیار میں سب سے پہلی شرط ہی" غیر مسلم" ہونا ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتی تو ایک ہزار سال پرانے راجہ داہر تک پہنچتے پہنچتے کوئی ایک دو مسلمان حکمران یا نامور شخصیات بھی مل ہی جاتیں لیکن ایسا نہیں ہوسکا؟ اور اگر واقعی سارے مسلمان حکمران ظالم، لٹیرے اور عیاش تھے تو پھر کس طرح اتنی بڑی آبادی ان کے دین پر رہی، نہ صرف مسلمان رہے بلکہ مستند عالم بنے۔عرب ممالک تک برصغیر کے علماء، علوم قرآن وحدیث کے ماہرین کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

حکومت کو ایسی مذموم حرکتوں کا نوٹس لینا چاہیے کہ یہ سب کس ایجنڈے کے تحت ہورہا ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ اگر رنجیت سنگھ اور راجہ داہر ہی ہیرو بنانے ہیں تو پھر برصغیر میں ایک الگ وطن کی ضرورت کیا تھی؟ اگر زمین، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر ہی ہیرو بنانے ہیں، دین کے تعلق کو تسلیم نہیں کرنا تو پھر پاکستان بنانے کی وجہ ہی ختم ہو جائے گی۔اہل دانش کو اس بارے میں غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ سب بنیادیں ہی ختم کر دی جائیں جن پر اس ارض پاک کی بنیاد ہے تو پھر قومی وحدت، اتفاق واتحاد کا تصور کہاں رہ جائے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نوجوان نسل کو من گھڑت قصوں اور ایک نئی تاریخ کے ذریعے قومی اساس سے دور کیا جا رہا ہے۔اگر یہی روش چل نکلی تو پھر ریاست بہاولپور کا ہیرو کوئی اور ہوگا، بلوچ اپنے سرداروں کو ڈھونڈیں گے؟ موہنجوداڑو والے ہزاروں سال پیچھے چلے جائیں گے؟ دراصل یہ دین کے نام پر جڑی قومی وحدت میں دراڑیں ڈالنے کی کاوش ہی ہے۔قومی اداروں کو ان اقدامات کا نوٹس لینا چاہیے یہ نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور ارض پاک کسی نئی آزمائش سے گزرے۔

خودنوشت مدیر

# مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا (۴)

## ملی مجلس شرعی کیسے قائم ہوئی؟

۱۶ مارچ ۲۰۲۰ء کو ملی مجلس شرعی کے صدر مولانا مفتی محمد خاں قادری صاحب کا سانحۂ ارتحال ہوا۔ اگلے دن تعزیتی ریفرنس میں بعض احباب نے خصوصاً عزیزم ڈاکٹر راغب نعیمی صاحب نے کچھ باتیں ملی مجلس شرعی اور ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شہادت کے حوالے سے کیں۔ اس چیز نے تحریک پیدا کی کہ مَیں اس موضوع پر قلم اٹھاؤں۔

مَیں ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری صاحب (مرحوم) سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ملا اور ان سے یونیورسٹی میں اپنے لیے کوئی مصروفیت دیکھنے کو کہا۔ یاد رہے کہ دسمبر ۱۹۸۹ء میں پاکستان میں علوم اسلامیہ کے سکالرز کے ۸ رکنی وفد کے امریکہ کے چار ہفتے کے دورے میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور کچھ دیگر لوگوں کے ساتھ راقم بھی شامل تھا۔ جلد ہی ہم مزاجی کا احساس ہوا اور مَیں اور ڈاکٹر انصاری صاحب اکثر ہوٹل میں کمرہ شیئر کر لیتے تھے اور اکٹھے واک پر جاتے تھے (ڈاکٹر صاحب واک کر کے شوگر کنٹرول کرتے تھے جو اس وقت ان کے ہاں ابتدائی مرحلے میں تھی)۔ اس سے ڈاکٹر صاحب سے دوستی اور بے تکلفی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ CV بھجوا دیجیے جو مَیں نے بھجوا دیا اور اس سے اگلے دن ہی انہوں نے مجھے اسلام آباد بلا لیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی (مرحوم) سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے شریعہ اکیڈمی میں اسسٹنٹ پروفیسر رکھ لیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر غازی صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب میں دوستی اور مزاجی ہم آہنگی تھی اور یہ جوڑی یونیورسٹی کے معاملات میں بھی صحت مندانہ انداز میں دخیل تھی۔

ڈاکٹر غازی صاحب مرحوم میری ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں سے واقف تھے، میرے کام سے خوش تھے اور بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس دوران مَیں نے محسوس کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل غیر فعال ہے اور مجھے یہ آئیڈیا سوجھا کہ اگر پرائیویٹ سیکٹر میں غیر حکومتی علماء کی

سطح پر مختلف مکاتب فکر کے متعدل مزاج علماء کرام کی ایک علمی مجلس بنالی جائے تو نہ صرف یہ معاشرے وریاست کو درپیش عصری مسائل پر ایک مشترکہ رائے دے سکتی ہے بلکہ یہ بین المسالک اور بین العلماء یکجہتی اور اتحاد پیدا کرنے میں بھی معاون ہوسکتی ہے۔ مَیں نے یہ آئیڈیا ڈاکٹر غازی صاحب سے شیئر کیا تو انہوں نے اسے پسند کیا اور تعاون کی حامی بھری۔ مَیں نے ان کے مشورے سے مقامی علماء وسکالرز کی ایک فہرست تیار کی اور ان کی ایک میٹنگ بلالی۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالغفار حسن (مرحوم) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس طرح کی مجلس کے لیے بہت پُرجوش ثابت ہوئے اور بڑھاپے اور بیماری (انہیں رعشا تھا) کے باوجود ہر میٹنگ میں حاضر ہوتے اور پوری دلچسپی لیتے۔ ان میٹنگوں میں ڈاکٹر غازی صاحب کے بہنوئی ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب بھی شریک ہوتے اور ڈاکٹر ادریس صاحب بھی (جو الھدیٰ کی بانی ڈاکٹر نگہت ہاشمی صاحبہ کے شوہر ہیں)۔ دوسری یا تیسری میٹنگ الھدی اسلام آباد میں ہوئی جس میں ڈاکٹر انصاری مرحوم بھی شریک ہوئے۔ پلاننگ کے اس مرحلے میں یہ ذکر بھی آیا کہ اگر یہ ادارہ یہاں مضبوط بنیادوں پر کام کرنے لگے تو مستقبل میں اس کے کردار کو بین الاقوامی بھی بنایا جائے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اپنے اور اپنے ادارے کی طرف سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا (وہ بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی [International Institute of Islamic Thought] ورجینیا، امریکہ کے پاکستان چیپٹر کے سربراہ تھے)۔

بعد میں انہوں نے مجھے ذاتی ملاقات کے لیے بلایا اور کہا کہ آپ نئے سرے سے کوئی ادارہ منظم کرنے کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں، ہمارا ادارہ حاضر ہے۔ میں نے وقتاً فوقتاً ان کے ہاں آنا جانا شروع کیا لیکن کام آگے بڑھانے کا کوئی راستہ نہ کھلا۔ دریں اثناء کام کو آگے بڑھانے کے لیے ہم نے میٹنگوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ بھی رک چکا تھا۔ مایوسی کی یہ فضا تھی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کیا جائے کہ لاہور گھر میں بچوں کی تربیت کے ایک دو شدید مسائل پیدا ہو گئے۔ دریں اثناء عبدالمالک مجاہد صاحب جو ریاض (سعودی عرب) میں ہمارے بے تکلف دوست تھے، انہوں نے لاہور میں دارالسلام کی ایک شاخ قائم کی تھی اور وہ مجھ سے مطالبہ کررہے تھے کہ میں لاہور جلد آؤں اور دارالسلام کے علمی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ چنانچہ میں نے لاہور واپسی کا پروگرام بنالیا۔ ڈاکٹر محمود غازی صاحب مجھے روکتے رہ گئے اور

میں استعفیٰ دے کر لاہور پہنچ گیا۔ ایک سال بعد میں نے بوجوہ پنجاب یونیورسٹی کا دائرہ معارف اسلامی (اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) جوائن کرلیا۔ اس دوران سپریم کورٹ میں سود کا مسئلہ زیر بحث تھا اور شریعت اپیل بنچ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمن صاحب نے کراچی میں یہ بیان دیا کہ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کو ہمارے مدد کرنی چاہیے جیسا کہ دوسرے ممالک میں ہوتا ہے کہ یونیورسٹیاں قومی مسائل کے حل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ میں نے علوم اسلامیہ وشرقیہ کی ڈین ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ سے ملاقات کی اور علوم اسلامیہ سے متعلق سارے اساتذہ و محققین کو جمع کر کے موضوعات ان میں تقسیم کیے اور ایک ماہ بعد فیکلٹی کی طرف سے سود کے حوالے سے ایک مبسوط رپورٹ سپریم کورٹ کے شریعت اپیل بنچ کو بھجوائی۔

اس دوران مَیں نے سوچا کہ علماء کرام کو آن بورڈ لینا چاہیے چنانچہ ہم نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں ’درس نظامی کی خوبیاں، خامیاں اور اصلاحی تجاویز‘ کے عنوان سے ایک سیمینار رکھا اور پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی (مرحوم) سے اس پر مقالہ لکھوایا جو دینی مدرسہ اور جدید یونیورسٹیوں دونوں کے فیض یافتہ تھے اور پختہ عالم تھے۔ سیمینار بہت کامیاب رہا لیکن وقت عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا۔ جسٹس خلیل الرحمن صاحب اور دیگر معزز مہربان بھی آ گئے تھے لہٰذا چائے اور رسمی گفتگوؤں نے کافی وقت لے لیا اور موضوع پر زیادہ گفتگو نہ ہوسکی۔ ہال کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب نے کہا موضوع پر گفتگو تشنہ رہی۔ آپ یہ سیمینار اگلے ہفتے ہمارے ہاں جامعہ نعیمیہ میں رکھ لیجیے۔ ہم نے اگلا سیمینار رکھا اور سارے مسالک کے علماء کو ایک ورکنگ پیپر تیار کر کے بھیجا۔ پھر ۸، ۹ ماہ تک اس موضوع پر اہل سنت کے سارے وفاقوں کے مقامی بڑے علماء سے مل کر اس پر محنت ہوئی۔ بالآخر درس نظامی میں اصلاح کے ایک پیکیج پر سارے مکاتب فکر کے علماء کرام نے دستخط کیے جس کی بنیاد پر درس نظامی کا اصلاحِ شدہ ورژن ہم نے علماء کو تیار کر کے دیا۔ یہ سارا کام ”مجلس فکر ونظر“ کے تحت ہوا کیونکہ اس وقت تک ملی مجلس شرعی قائم نہ ہوئی تھی۔ یہ سارا کام ”ہمارا دینی نظامِ تعلیم“ کے نام سے ہماری کتاب میں طبع شدہ موجود ہے۔

مجلس فکر ونظر کے تحت علماء وسکالرز کا ایک روزہ سیمینار ”اسلام، جہاد اور دہشت گردی

کے موضوع پر ہمدرد ہال لاہور میں ہوا جس میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام اور یونیورسٹیوں کے علوم اسلامیہ کے پروفیسرز شریک ہوئے۔اس کی تفصیلات ہماری مرتب کردہ کتاب ''اسلام، جہاد اور دہشت گردی'' میں موجود ہیں۔

اسی دوران ہم نے تحریک اصلاحِ تعلیم قائم کرلی تھی۔اس کے تحت ہم نے شروع اگست ۲۰۰۷ء میں جامع شان اسلام گلبرگ لاہور کے کشادہ تہہ خانے میں موجود 'ارقم شان اسلام سکول' کے پرائمری سیکشن میں دوروزہ تربیتی ورکشاپ جدید سکولوں کے پرنسپلز کے لیے رکھی۔ تیسرا دن ہم نے دینی مدارس کے مہتمم حضرات کی ٹریننگ کے لیے رکھا جسے ہم نے علماء کرام کے احترام میں باہمی تبادلۂ خیال کی مجلس کا نام دیا۔اس میں بھی سارے مسالک کے علماء کرام موجود تھے۔اس تقریب کے آخر میں مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب نے تجویز پیش کی کہ مدارس کی اصلاح اور بہتری اور اس طرح کے دوسرے کاموں کے لیے ایک مستقل مجلس ہونی چاہیے، کبھی کبھار اس طرح کی ایک میٹنگ اس کے لیے زیادہ نفع بخش نہیں ہوسکتی۔اس پر موجود علماء کرام نے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ اس طرح کی مستقل مجلس کے قیام کے بارے میں غور کرنے کے لیے اگلا اجلاس جامعہ نعیمیہ میں رکھا جائے۔ چنانچہ یہ اجلاس ۹/اگست ۲۰۰۷ء کو جامعہ نعیمیہ میں ہوا جس میں صلاح مشورے کے بعد اس کا نام 'ملی مجلس شرعی' تجویز ہوا۔اتفاق رائے سے ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کو اس کا صدر اور راقم کو اس کو رابطہ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔اس اجلاس میں جو علماء کرام شریک ہوئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا ڈاکٹر سرفراز نعیمی (شہید)، مولانا مفتی محمد خاں قادری (مرحوم)، (میں نے جامعہ نعیمیہ کے فارغ التحصیل مولانا پروفیسر محمد رفیق چوہدری صاحب کو دعوت دی تھی وہ تشریف نہ لاسکے)۔مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا حافظ ارشاد الحق اثری (فیصل آباد)،مولانا زاہد الراشدی (گوجرانوالہ)،مولانا حافظ فضل الرحیم،مولانا عبدالرؤف فاروقی اور مولانا عبدالمالک۔

ملی مجلس شرعی تب سے الحمدللہ باقاعدہ کام کررہی ہے۔اس نے سارے مکاتب فکر کی مشترکہ علمی مجلس کے طور پر بہت مفید علمی کام کیے ہیں اور اہم ملی وقومی موضوعات پر رپورٹیں تیار کی ہیں اور قراردادیں پاس کی ہیں تاہم آج کل کے میڈیا کے دور میں ہم اس کی مناسب

پبلسٹی نہیں کر سکے اور نہ اسے ملک گیر تشخص دے سکے ہیں۔

## ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شہادت

ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شہادت نہ صرف ملی مجلس شرعی کے ارکان کے لیے بلکہ میرے لیے ذاتی طور پر اور پوری ملت اسلامیہ پاکستان کے لیے ایک صدمہ اور نقصان تھی۔ اسی شام مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب کے ہاں مجلس کا اجلاس تھا جس کی صدارت ڈاکٹر صاحب نے کرنا تھی۔ وہ اجلاس تعزیتی اجلاس میں بدل گیا۔ سب لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کے جانے کا غم تھا۔ وہ بلاشبہ معتدل مزاج تھے اور سارے مکاتب فکر کو ساتھ لے کر چلنے والے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے بارے میں حکومت اور پولیس نے تفتیش کے بعد کوئی بیان جاری نہیں کیا اور نہ کسی پر اس کی ذمہ داری ڈالی تاہم ایک عام خیال یہ تھا کہ یہ دھماکہ پاکستانی طالبان نے کیا تھا کیونکہ اس وقت پاکستان میں اس طرح کے دھماکے ہو رہے تھے اور کئی مزارات پر بھی ہوئے جس سے فرقہ وارانہ عصبیت کی بو آتی تھی اور اس پر ردّ عمل بھی سامنے آیا۔ ۱۷ مارچ ۲۰۲۰ء کو مفتی محمد خاں قادریؒ کے تعزیتی ریفرنس میں ڈاکٹر راغب نعیمی صاحب نے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا کہ حملہ صرف ڈاکٹر صاحب پر ہی کیوں ہوا؟ ملی مجلس شرعی کے کسی اور آدمی پر کیوں نہیں ہوا؟ اور یہ بھی کہا کہ لگتا ہے کہ ملی مجلس شرعی پیچھے رہ گئی اور ڈاکٹر صاحب آگے نکل گئے۔

ملی مجلس شرعی کے ارکان تو جانتے ہیں ہم عام لوگوں کی معلومات کے لیے عرض کرتے ہیں کہ ہم ملی مجلس شرعی میں کوشش کرتے ہیں کہ زیر بحث معاملے میں سارے مکاتب فکر کے علماء کرام کا اتفاق ہو جائے لیکن بعض اوقات ایسا ہو نہیں پاتا۔ بدقسمتی سے ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں دینی لوگوں کی ساری تعلیم و تربیت مسلک پرستانہ ماحول میں ہوتی ہے۔ مساجد، دینی مدارس اور ان کا نصاب اور اساتذہ کا تدریسی عمل سارا مسلک پرستی پر مبنی ہوتا ہے۔ ان حالات میں ہم جن لوگوں کو ملی مجلس شرعی میں بلاتے ہیں، ان کی اکثریت معتدل مزاج ہوتی ہے اور مجلس میں اختلافی آراء برداشت کی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود

مسلکی اختلافات اتنے گہرے ہیں کہ بعض اوقات ان سے باہر نکلنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم ملی مجلس شرعی کی طرف سے کوئی اعلامیہ یا قرارداد پاس ہی نہیں کرتے اور بحث ومناقشہ کے بعد اٹھ جاتے ہیں۔

پاکستان میں دہشت گردی اور پاکستانی طالبان کے حوالے سے ملی مجلس شرعی کے اجلاس میں کئی بار گفتگو ہوئی۔ کوئی آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو اس دہشت گردی کی مخالفت اور مذمت نہ کرتا ہو (البرہان کی فائلیں گواہ ہیں کہ ہم نے ذاتی طور پر بھی ان کی ہمیشہ مخالفت کی اور کڑے لفظوں میں کی) لیکن اس کے باوجود مجلس دہشت گردی کی عمومی مذمت کے سوا آگے نہیں بڑھ سکی۔ جو بات زبانوں پر کبھی نہیں آئی اور نہ کبھی ہم نے شعوری طور پر آنے دی اور نہ آج تک اس مجلس میں الحمدللہ کبھی تو تکار کی نوبت آئی اور نہ کبھی آوازیں بلند ہوئیں....لیکن سب جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ پاکستانی طالبان مسلک کے لحاظ سے حنفی دیوبندی تھے اور پاکستان کے حنفی بریلوی مسلک کے لوگ ان جنگجوؤں کے مخالف اور مذمت کرنے والے تھے۔

اس سارے عرصے میں ملی مجلس شرعی کا یہی طریقہ رہا لیکن ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کی شناخت صرف یہ نہیں تھی کہ وہ ملی مجلس شرعی کے صدر تھے بلکہ یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ ان کی بنیادی شناخت یہ تھی اور یہی ان کی شہرت کا باعث تھی کہ وہ حنفی بریلوی مسلک کی ایک بڑی جامعہ کے مہتمم تھے اور اس مسلک کے ایک بڑے عالم تھے۔ اور یہ بھی کہ ان کے مسلکی حلقۂ احباب میں ایسے کئی لوگ تھے جو ملی مجلس شرعی کے طریق کار کے حامی نہ تھے اور ڈاکٹر صاحب کو طالبان کی دہشت گردی کے خلاف اپنے موقف کو مزید سخت کرنے پر اکساتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں ڈاکٹر سرفراز صاحب کے طالبان کے خلاف سخت مذمتی بیانات آرہے تھے، میرے جی میں آئی کہ ان سے کہوں کہ ذرا ہاتھ ہولا رکھیں لیکن مَیں نے فون پر یہ بات کہنا مناسب نہ سمجھی۔ اور چونکہ مجلس کا انعقاد پہلے سے طے تھا لہٰذا ذہن میں تھا کہ ان سے ملاقات ہوگی تو ان سے اس موضوع پر بات کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے ہی جامعہ نعیمیہ میں دھماکا ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب شہید ہوگئے۔ **انا اللہ وانا الیہ راجعون۔**

ظاہر ہے ڈاکٹر سرفراز صاحب کے جانے کا دُکھ ہمارے لیے اجتماعی تھا جب کہ راغب

نعیمی صاحب کے لیے ذاتی تھا اور فطری طور پر شدید تھا۔ مجلس کے ارکان کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے بعد مفتی قادری صاحب صدارت سنبھالیں۔ شروع میں مفتی صاحب کی طبیعت بھی مکدر تھی اور وہ متذبذب تھے لیکن پھر مجلس کے پرانے ساتھیوں کے شدید اصرار پر اور امت کا فائدہ دیکھتے ہوئے انہوں نے مجلس کی صدارت قبول فرمالی۔

تلخیص کے طور پر مَیں پھر دہراتا ہوں کہ ملی مجلس شرعی کا رویہ پاکستان میں دہشت گردی کی مذمت کا تھا۔ ہمیں اس کا احساس تھا کہ پاکستانی طالبان (جو حنفی دیوبندی تھے) امریکہ اور بھارت کے مہرے تھے اور دشمن کی چال یہ تھی کہ پاکستان میں دہشت گردی کر کے معاشرے میں خوف اور افراتفری پیدا کی جائے۔ دینی قوتوں (خصوصاً دیوبندی بریلوی مسلک) کو آپس میں لڑایا جائے تاکہ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوجائے خصوصاً اسی مقصد سے بزرگوں کے مزارات پر حملے کیے جارہے تھے۔ پاکستانی فوج پر ایک طرف امریکی دباؤ تھا تو دوسری طرف دہشت گردی کا خاتمہ اور ملکی سرحدوں کی حفاظت بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس پیچیدہ صورت حال میں ہم یہی کر سکتے تھے کہ طالبان کی اور بیرونی قوتوں کی دہشت گردی کی مذمت کریں اور ہم نے یہ کی، خصوصاً مزارات پر حملوں کی.... لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش بھی تھی کہ دیوبندی بریلوی مسالک میں اختلاف اور دشمنی کی آگ نہ بھڑک اٹھے اور الحمدللہ ہم نے اس میں اپنا کردار ادا کیا، خواہ معمولی ہی سہی۔ ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے جو کیا وہ ٹھیک تھا اور ہم نے اس ضمن میں کوئی غلطی نہیں کی جس پر ہمیں شرمندگی ہو۔ ڈاکٹر راغب نعیمی صاحب اگر ٹھنڈے دل سے ہمارے موقف و مشرب پر غور کریں تو شاید انہیں بھی ہم سے کوئی گلہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مجلس میں فعال کردار ادا کریں اور اپنے والد گرامی کا اتحاد امت اور اتحاد بین المسالک والعلماء کا خواب پورا کرنے کے لیے اس کی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کریں۔